5/7
A/14

بھوکا ہی بنگال

مرتبہ ابراہیم جلیس

چند لکھنے والے

دیوندر ستیارتھی	جوش ملیح آبادی	سبط حسن
پرتھوی ناتھ شرما	جگر مراد آبادی	اختر اورینوی
سومناتھ لہری	علی سردار جعفری	شاہین فاروقی
ریوتی سرن شرما	کیفی اعظمی	اختر شیرانی
انند نرائن ملا	اختر الایمان	مرزا ادیب
رام پرکاش اشک	مخدوم محی الدین	محبوب حسین جگر

نفیس اکیڈمی

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

دو روپیہ چھ آنہ سکہ عثمانیہ

دو روپیہ چودہ آنہ کلدار

جملہ حقوق بحق چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک نفیس اکیڈمی عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن محفوظ ہیں

عنوان

ALLAMA IQBAL LIBRARY
3519

طبع اوّل ایک ہزار

جنوری سنہ ۱۹۴۶ء

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
Ac 3549
Date 16-6-51
SRINAGAR

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

1397

فہرست

		صفحہ
بنگال کیوں کنگال ہوا؟	ابراہیم جلیس	۷
بھوکا ہے بنگال	دامق	۱۳
سنہ ۱۹۴۳ء	سومناتھ لہری	۱۵
کال گیت	جوش ملیح آبادی	۵۱
زندگی کی نقش گری	سبط حسن	۵۴
بنگال	جگر مرادآبادی	۶۳
قبروں کے بیچوں بیچ	دیوندر ستیارتھی	۶۴
فاقہ کشان بنگال	اختر شیرانی	۸۲
جنگل	اختر اورینوی	۸۳
کلکتے کے بازاروں میں	ساحر لدھیانوی	۹۶
کنگال دیس میں	میرزا ادیب	۹۸

کلکتہ	اختر انصاری	۰۵
دراڑیں	دیوتی سرن شرما	۱۰۶
ہیضہ	احمد ندیم قاسمی	۱۱۲
زندگی کی ایک شام	ریاض رؤفی	۱۱۴
بنگال	علی سردار جعفری	۱۲۸
چاول کے دانے	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۱۳۱
بنگال	مخدوم محی الدین	۱۴۷
حدِ نظر	محبوب حسین جگر	۱۴۹
ایک سوال	اختر الایمان	۱۵۲
میں مر نہیں سکتا	پرتھوی ناتھ شرما	۵۶
بنگال	نظر حیدر آبادی	۷۱
چور	ابراہیم جلیس	۱۷۴
کلکتے کا ذکر	حفیظ ہوشیارپوری	۱۸۵
ننگ و ناموس خطرے میں	کلپاوت	۸۶
بنگال	اختر عادل (علیگ)	۴

نئے دھان سے پہلے	دیوندر ستیارتھی	۱۹۶
بنگال	عبدالقیوم خاں باقی	۲۱۵
بنگال کا خونین جغرافیہ	عبدالقیوم خاں باقی	۲۱۷
کلکتہ	کیفی اعظمی	۲۲۷
ہا ہا کار	ممتاز حسین جونپوری	۲۲۸
بنگال	رام پرکاش اشک	۲۳۶
لاشوں کی قطاریں	سومناتھ لہری	۲۳۸
بنگال کی کہانی	احمد ریاض	۲۴۶
فراری	شاہین فاروقی	۲۴۷
موت	انند نرائن ملّا	۲۵۹
گیتوں کی بستی میں	شاہد صدیقی	۲۶۰
بنگال	سلیمان اریب	۲۶۲

"اَن داتا"

کرشن چندر

بنگال کے حزنیے پر اردو میں صرف ایک ہی
ابدی کہانی لکھی گئی ہے اور وہ اَن داتا ہے۔ اِس
کہانی کو ترقی پسند ادب کے ہر قاری نے پڑھا ہے.
اِس کے تراجم، انگریزی اور چینی زبانوں میں بھی
ہو چکے ہیں اور ہر بڑے شہر کی ڈرامیٹک سبھاؤں
نے پیش کیا ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ یہ کہانی مسٹر
کرشن چندر کی اِجازت کے باوجود مجموعے میں
شامل نہیں ہے۔ وجہ ؟
ہے کچھ ایسی ہی بات .....

ابراہیم جلیس

بنگال کیوں کنگال ہوا؟

آج اگر لارڈ کرزن زندہ ہوتے تو بنگال کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ جب اُنھوں نے بنگال کی بہبودی کی خاطر تقسیم بنگالہ کی اِسکیم پیش کی تھی تو ناعاقبت اندیش ہندوستانیوں نے کیسا شور مچایا تھا۔! اظہار نفرت کے جلسے کئے گئے ملامت کی قرار دادیں پاس ہوئیں۔ سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے بھی احتجاج کیا۔ چنانچہ سرور جہاں آبادی کی وہ نظم ——— آہ بنگال ——— زبان زد خاص و عام تھی جس کے چند شعر پڑھیئے۔

آہ اے بنگال آلام و مصائب کے شکار
آہ اے کرزن کی پالیسی کے صیدِ بیقرار
آہ اے بنگال اے ذلت نصیب و متذل کیا ہوئی وہ تیری عظمت کیا ہوا تیرا وقار
کرزنِ بیداد خو، اہل پولس، حکام وقت تو ہوا اُف اُف نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار

تقسیم بنگال ایک لازمی تجویز تھی۔ بنگال کو بہر صورت ٹکڑے ہونا تھا لارڈ کرزن کے زمانے میں نہ سہی لارڈ ویول کے زمانے میں سہی۔ اور بنگال دو ٹکڑے ہو گیا۔ دو حصّوں میں بٹ گیا۔

ایک حصّہ چور بازار کہلاتا ہے۔

دوسرے حصّے کا نام قبرستان ہے۔

اب وہ بنگال مر چکا ہے جو خانہ آرائے ہُنر تھا۔ دیارِ سحر و نغمہ تھا۔ شعر و فلسفے کا شبستان تھا۔ غزالی آنکھوں اور لمبی گیسوؤں کا پیکر تھا۔ ٹیگور، بوس، سرت چندر چٹرجی اور نذر الاسلام کا وطن تھا۔ آج بنگال خونین جگر، خونین کفن، خونین مزار ہے۔ ناوک جور فلک کا آماج گاہ ہے۔ بھوکوں، ننگوں کا وطن ہے سرمایہ داروں کے زہراب کا جرعہ کش ہے ——— اور اس کے لئے سارے ہندوستان کی آنکھیں نمناک ہیں۔

یہ بنگال ——— ! اِس دَم توڑتے ہوئے بنگال کے پس منظر کو دیکھئے۔ سامراجی مسموم ہوائیں اُفق بنگال پر قحط کے گھنے گھنے بادل اِکٹھا کر رہی ہیں۔ بنگال پر موت کی مہیب اندھیری پرچھائیاں پھیل گئی ہیں۔ موت کی پری اپنے کالے کالے پر پھیلائے چھ کروڑ اِنسانوں پر منڈلا رہی ہے۔ بھوکے ننگے جسموں سے کراہیں نکل رہی ہیں۔

"ماں بھوک لگی ہے"

"بیٹا ——— چاول لایا ——— ؟"

"بابا ——— میرا آخری وقت آگیا"

"سیٹھ۔ میں مر رہی ہوں۔ تھوڑا سا چاول دیدو"

سیٹھ جواب دیتا ہے ——— چاول نہیں ہے ——— چاول سارے

بنگال میں کہیں نہیں ہے۔ قحط سے پہلے چاول کی پیداوار چھ کروڑ انسانوں کی مانگ سے صرف ۴ ٪ کم ہوتی تھی لیکن ۱۹۴۳ء کے آغاز میں ۱۵ ٪ کم ہوگئی۔ اِسی لئے سیٹھ مسکرا کر جواب دیتا ہے ——— چاول نہیں ہے! مگر چاول اس کے پاس ہے۔ اور وہ اپنے گھر میں چاول کے تھیلے کے تھیلے چھ کروڑ انسانوں کی نظروں سے چھپا چھپا کر جمع کر رہا ہے۔ کیونکہ نومبر ۱۹۴۲ء چاول کی قیمت صرف چھ روپیہ من تھی۔ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں چودہ روپیہ من ہوگئی سیٹھ بڑا دور اندیش ہے وہ ہر ایک کو جواب دیرہا ہے ——— چاول نہیں ہے۔ اور چاول کی قیمت تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔

اپریل ۱۹۴۳ء ——— ۲۴ روپیہ فی من

مئی ۱۹۴۳ء ——— ۳۰ روپیہ فی من

جون ۱۹۴۳ء ——— ۳۲ روپیہ فی من

جولائی ۱۹۴۳ء ——— ۳۵ روپیہ فی من

اگست ——— ۳۸ روپیہ فی من

یہ کلکتہ کی حالت تھی۔ وہی کلکتہ جو برطانوی شہنشاہیت کا دوسرا خوبصورت شہر ہے۔ لوگ شاہراہوں اور فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہے ہیں۔ سرمایہ دار فاقہ زدہ عورتوں کو گِدھوں اور چیلوں کی طرح نوچ رہے ہیں۔

اَب ذرا کلکتے سے باہر چلیئے۔ کلکتے کی جتنی رگیں سارے بنگال میں پھیلی ہوئی ہیں اُن پر اَن گنت لاتعداد دیہاتی چیونٹوں کی طرح رینگتے ہوئے کلکتے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چاول دیہاتوں میں بھی نہیں ہے۔ چاول نہ دیہاتوں میں ہے اور نہ کلکتے میں ——— چاول گوداموں میں ہے۔ پورا سوا دو کروڑ من چاول ہے۔ جو ایک مہینے کے لئے پورے چھ کروڑ انسانوں کے پیٹ بھر سکتا ہے۔

ان کو موت کے تیز دانتوں سے بچا سکتا ہے، مگر ہے کوئی مائی کا لال جو ایک من چاول سو روپئے میں خریدے ——— ! ذرا آگے تو آئے ——— !!

کسی میں آگے آنے کی ہمت نہیں ہے. سب پیچھے ہٹ رہے ہیں. کسی کی نازک و کومل کنواری بک رہی ہے. کسی کا کھیت بک رہا ہے. کسی کا گھر بک رہا ہے. سب کے گھر بک گئے. سب کے کھیت فروخت ہو گئے. کلکتے کے سوا لاکھ کنگالوں میں تیس ہزار عورتیں اپنی عصمتیں گنوا بیٹھیں ——— تیس ہزار گوہر عصمت خاک میں مِل گئے. بیشمار گھر نیلام ہو گئے. کھیت کوڑیوں کے مول فروخت ہو گئے. اِنتقال اراضی کا روزانہ اوسط ایک سو کھیت ہے. کھیت بیچ کر دیہی صنعتوں کا گلا گھونٹ کر، اپنے جنم بھومی چھوڑ کر ساڑھے پانچ کروڑ دیہاتی بنگال کی رگوں سے چمٹے رینگ رہے ہیں ——— شہ رگ کی طرف ——— کلکتے کی طرف. مزدوری کے لئے. چاول کے لئے. لیکن کلکتے میں چاول ہے اور نہ مزدوری ——— یہ اَن پڑھ جاہل دیہاتی شہری میشنی کام کیا جانیں ——— ؟

بنگال میں تقریباً پانچ ہزار لنگر خانے ہیں. لیکن لنگر خانوں میں صرف ایک وقت کھچڑی مِلتی ہے. ایک وقت کی کھچڑی سے کیا ہوتا ہے. وہ تو کئی وقتوں سے بھوکے ہیں. اور پھر ایک وقت کی کھچڑی میں آخر کتنی زندگی ہوتی ہے ——— ؟ چاول نہیں. کھچڑی نہیں. یہ گھاس، یہ درختوں کے پتے اور یہ جڑی بوٹیاں کھاؤ ——— !"

اب بنگال میں صرف گھاس، درختوں کے پتے، اور جھاڑیوں کی جڑیں سستے داموں مِل رہی تھیں ——— اور ڈھائی کروڑ باشندے انہی پر اپنی رال ٹپکا رہے تھے. اموات میں "دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی. بھوک سے مرنے کے علاوہ بنگالی پیٹ کی بیماریوں، ہیضہ، اِسہال، دست، پیچش اور جلندر کے

جیل میں تھی۔ انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعے آزاد تجارت اور ڈاکٹر مکرجی کی حمایت کی اور بنگال لاچار ہو کر قبروں تلے دفن ہوتا گیا۔

اصفہانی کو شکست ہوئی۔ لیگی وزارت کو شکست ہوئی۔ ڈاکٹر مکرجی اور ہندو ساہوکار اور ادارے اپنی فتح پر نازاں اور مسرور تھے اور ننگا، بھوکا، بنگال موت کی ہچکیاں لے رہا تھا اس وقت بنگال کی صرف نوجوانوں نے مدد کی۔ ان نوجوانوں نے جن کے ہاتھ میں لال جھنڈا تھا۔ پہلو میں خالص انسانی دل، آنکھوں میں ایک رخشندہ مستقبل کی چمک اور ہونٹوں پر یہ طنزیہ سوال تیری شہرت کے نشاں بنگال مٹ جائینگے کیا

رمیٹ دے سو بار تجھکو آہ دورِ روزگار ؟ (سرور جہاں آبادی)

۲

یہ کتاب بنگال کی موت کے اسی جانگداز سانحے کی ایک تاریخ ہے اِس تاریخ کی ہمیں اور ہماری آنیوالی نسلوں کو شدید ضرورت ہے کیونکہ سامراجی تاریخ شائد اس کو کلنگ کا ٹیکہ سمجھکر ہم سے اور ہماری آنیوالی نسلوں سے چھپانے کی کوشش کرے۔

یہ مجموعہ ہیبت ناک مضامین، افسانوں اور نظموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے کیونکہ بنگال کی موت سارے ہندوستان کی موت ہے مجھے اِعتراف ہے کہ اِس مجموعے کے بعض افسانے اور نظمیں محض تخیل اور احساس کی پیداوار ہیں مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ حقیقت تخیل یا تصور سے کہیں زیادہ، کئی گنا زیادہ بھیانک اور اندوہ گیں ہے۔ تخیل اور تصور کا زیادہ سے زیادہ مبالغہ بھی اس حقیقت کو نہیں پہنچ سکا ہے جو آج بنگال کی موت کا سبب بنی ہوئی ہے۔

آخر میں ان تمام دردمند فنکاروں کا جنکی نگارشات سے یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں سجاد ظہیر علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، سلم ضیائی، میر عابد علیخاں کو کبھی نہیں بھول سکتا جنھوں نے اِس مجموعے کی ترتیب و اشاعت میں میری خلوص معاونت کی ہے۔

اِبراہیم جلیس
یکم جنوری ۱۹۴۴ء

نفیس اکیڈمی

شکار ہونے لگے۔ سوجے ہوئے بدن، جن سے رِستا ہوا پانی، اور اٹھتا ہوا تعفن ——
سارا بنگال متعفن اور مسموم ہو گیا۔ ڈاکٹر نارائین راؤ نے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری
کامریڈ پورن چند رجوشی سے بڑے یاس انگیز لہجے میں کہا ——————

"ان بیماریوں کی وجہ سے ہر روز بیس بیماروں میں سے اُنیس مر جاتے ہیں"

بیس انسانوں میں اُنیس کی موت ——— اور روزانہ اموات کا اوسط
دو ہزار تھا۔ ہر روز دو ہزار آدمیوں کے دو ہزار جسم، دو ہزار معاشرتیں، دو ہزار تہذیبیں
دو ہزار محبتیں مر رہی تھیں۔ اور بنگال میں چور بازاروں کے گودام اور قبرستانوں
کی کھائیاں بھرتی جا رہی تھیں۔ دَم توڑتے ہوئے اِنسانوں کی کراہوں کے ساتھ
ساتھ بنگال کی فضا میں یہ نعرہ بھی گونج رہا تھا۔

"جس کا قبضہ چاول پر اس کی حکومت بنگال پر"

مگر بنگال پر تو لیگی حکومت تھی۔ لیگی وزارت نے اپنے دورِ اقتدار کے ماتھے
سے یہ کلنگ کا ٹیکہ مٹانے کے لئے کانگریسی رہنماؤں سے مدد اور اشتراک کی دعوت
دی۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کو مشترکہ وزارت میں شامل کرنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر مکرجی نے
فضل حق کو بھی ساتھ لانا چاہا۔ فضل حق کی شرکت مسلم لیگ کو گوارا نہ تھی ———
لیگی وزارت تنہا رہ گئی۔ اُس نے مجبور ہو کر فراہمی اجناس کے لئے مسلمان بیوپاریوں
کی طرف توجہ کی۔ اور مسٹر اصفہانی کو اپنا غذائی ایجنٹ بنایا۔ ڈاکٹر مکرجی کو آگ لگ گئی
——— اور اُنھوں نے سارے ہندو ساہوکاروں اور غذائی اداروں کو متحد کیا
اصفہانی کے خلاف مارواڑی چیمبر آف کامرس نیشنل چیمبر آف کامرس، انڈین مرچنٹس
چیمبر کا ایک بہت بڑا محاذ بنایا۔ ہندو کسانوں نے اپنا غلہ اصفہانی کو بیچنے کے بجائے
ہندو اداروں کے ہاتھ بیچنے کو بہت بڑا مذہبی ثواب سمجھا۔

کانگریسی رہنما کیرن شنکر رائے مجبورِ محض تھے۔ کیونکہ ساری سر برآوردہ کانگرس

احمد مجتبیٰ دامق

بھوکا ہے بنگال

(کورس)

یورپ دیس میں ڈگی باجی — پھیلا دکھ کا جال
دکھ کی اگنی کون بجھائے — سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے — آج وہی کنگال رے ساتھی — آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

پیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے — لاکھوں الٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر — اترے موت کے گھاٹ
جین مرن کے ڈانڈے ملائے — بیٹھے ہیں چنڈال رے ساتھی — بیٹھے ہیں چنڈال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

ندی نالہ گلی ڈگر پر — لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے پر — الٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر — سستا ہے یہ مال رے ساتھی — سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے — بنیئے سارا ناج
سندر ناری بھوک کی ماری — بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے — چار طرف بھونچال رے ساتھی — چار طرف بھونچال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

پرکھوں نے گھر بار لٹائے چھوڑ کے سب ساتھ
مائیں روئیں بلک بلک کر بچے بھوئے انا تھ
سدا سہاگن بدھوا بابا جے کھولے سر کے بال رے ساتھی کھولے سر کے بال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

اتی پتی چبا چبا کر جوجھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگٹ مارے بدلے سو سو بھیس
کال بکٹ پھیلائے رہا ہے بیماری کا جال رے ساتھی بیماری کا جال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

دھرتی ماتا کے سینے میں چوٹ لگی ہے کاری
مایا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری
اب سے اٹھ جاگنید کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال رے ساتھی دیکھ تو جگ کا حال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

سومناتھ لہری

۱۹۴۳ء

ایک بنگالی کہانی

ٹاٹ کے کارخانے کا بیچنگ اور سائیننگ ڈیپارٹمنٹ ہے۔ مزدور لوگ اسے عورتوں کا کارخانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں کام کرنے والی زیادہ تر عورتیں ہیں۔

بڑا سا مکان ہے۔ فرش سے چھت تک مکان کے سارے ماحول میں جوٹ کے ریشے اور جوٹ سے نکلی ہوئی دھول یوں دکھائی دیتی ہے جیسے خوب تپلا سپید کھرا ہو۔ ایسا کھرا نہیں، جس میں کچھ نظر ہی نہ آتا ہو۔ مزدور عورتوں کی ہر سانس کے ساتھ تھوڑی دھول اور تھوڑے ریشے تو جائیں گے ہی، پہلے پہل تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے سب گوارا ہو جاتا ہے۔

جہاں رانی کام کرتی ہے۔ وہاں سے آس پاس کی عورتوں کو خوب پہچانا جا سکتا ہے۔ بہت دور سے دیکھنے پر اس کھرے میں اتنا صاف پہچانا نہیں جاتا۔ درمیان میں بجلی کی تیز روشنی ہے۔ وہاں پر کھرا چھٹا چھٹا سا ہے۔ دھول کے ذرّے روشنی میں چمکتے ہیں تو اُن کے بیچ میں سپید سپید ریشے صاف چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دور کھرے میں ایک سایہ سا داخل ہوا۔ تھوڑا اندر آنے پر معلوم ہوا کہ

رانی ہی کی طرف آرہا ہے۔

رانی کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔ مردوا آج کہیں پھر وہی بات تو نہیں اٹھائیگا؟ سردار سے بے مروت ہو کر مزدوری کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا گھر ہے، شوہر ہے، چھ برس کا بچّہ ہے۔ کلموا سردار کیا دھرم کی دُہائی بھی نہیں مانے گا۔ ہائے بھگوان!

امیدی سردار، رانی کے پاس آکر رُک گیا۔ سینہ تان کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ہنسا۔ آگے کے دو دانتوں میں سونا مڑھا تھا۔ پان اور "کھینی" کے داغوں کے درمیان، سونا چمک اٹھا۔

"کہو جی رانی بی بی اب کیا کرنا ہوگا؟ اس کارخانے سے تو اب دانہ پانی اٹھ گیا ——؟"

رانی کی چھاتی گویا کارخانے کی آواز کے ساتھ تال دیتی ہوئی دھک دھک کرنے لگی۔ کیا سچ مچ سردار کام چھڑا دے گا؟ تب کھوکا کیا کھائے گا؟ پتی سے کیا کہوں گی؟ کیا یہ بات پتی سے کہی جا سکتی ہے کہ سردار دھرم بگاڑنا چاہتا ہے؟ اور پھر کہنے سے کیا ہوگا۔ وہ وشواش بھی کرے گا؟ ..... نہیں، جا کر چھوٹے صاحب کے پیر پکڑ لوں گی۔ شام کو جب وہ میم کو لے کر گنگا گھومنے جاتے ہیں۔ میم صاحب عورت ذات ہیں۔ کیا انھیں بھی دیا نہ آئے گی؟ کون جانے؟ —— سردار کی باتوں کے آگے معمولی مزدورن کی بات کا کیا وشواش ہوگا؟ ——"

ایک سانس میں کتنے وچار، پھیلنے اور بھٹکنے لگتے ہیں۔ سردار کیا کہہ رہا ہے وہ یہ بھی نہیں سُن پاتی۔ سردار نے جب چاروں طرف چوکنی طرح دیکھ کر اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھا۔ تو اس نے یکایک چونک کر سُنا۔ سردار کہہ رہا تھا ——— "ملٹری نے یہ کارخانہ لے لیا ہے۔ ان کا لڑائی کا سامان تیار ہوگا۔ اب یہاں بورے نہیں بنیں گے۔ سب مزدور مزدورنیوں کو کام سے جواب ہے۔ تیرے مرد کا بھی کام ختم۔ مل سے سستا چاول، آٹا بھی بند ہو گیا۔ اب کیا کھائے گی؟"

بپتا بھری خبر ——— ! پر آگے کیا ہوگا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سارے خیالات دبا کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ چلو جان بچی، اب سردار کام چھڑانے کی دھمکی تو نہ دے سکے گا۔ نوکری کیوں چھوٹ گئی۔ اس کا کارن بھی شوہر سے نہ کہنا ہوگا سب کا ہی تو کام چھوٹے گا۔ سب ہی تو ایک چھپر کے نیچے ہیں۔

دور ——— چھوٹے صاحب داخل ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر سردار آگے بڑھ گیا۔

رانی اور اُس کا شوہر بسیسو ——— کسی وقت گاؤں میں رہتے تھے۔ بسیسو کا ایک چھوٹا بھائی کسن بھی تھا۔ تین چار بیگھے دھان کی کھیتی، ایک ٹوٹا پھوٹا گھر ——— اور بس۔

تین چار بیگھے زمین سے کیا بنتا ہے۔ سال بھر کی خوراک بھی نہیں اُگتی مہاجن کا قرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ زمین تو رہن تھی ہی، گھر کی زمین بھی گروی ہو گئی۔ فصل کا بیشتر حصہ مہاجن کو چلا جاتا تھا۔ تین چھوڑا ایک آدمی کا بھی گزارا نہیں ہوتا۔ اس لئے انھوں نے سوچا کہ زمین سے جو وصول ہوگا۔ اس کی دیکھ بھال کسن کر لے گا ——— بسیسو اور اس کی بیوی شہر چلے آئے۔ بہت کھوجنے پر گاؤں کی پہچان کے ایک مستری کی معرفت بڑے سردار کو رشوت دے کر بسیسو نے ٹاٹ کے کارخانے میں کام حاصل کیا۔ وہ بھی پکّا نہیں عوضی کا ——— بیچ بیچ میں بیکار بیٹھنا پڑتا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ ہفتے میں تین چار روپے تو گھر آتے ہی ہیں۔ بالکل

پھر ایک بچہ جنا۔ دو منہ تو کسی طرح بھرے جا رہے تھے اب ایک اور بڑھ گیا۔ بچے کچھے خالی رینگنے کو ہی پیدا ہوتے ہیں۔

پھر بھی عورت مضبوط ہے۔

اس کے جسم میں جان ہے۔ ٹاٹ کے کارخانے میں کام پر لگا دیا جائے تو اسے دیکھ کر سردار کام بھی دے سکتا ہے۔ عورت کی مزدوری سے دو چار روپے اور مل جائیں گے۔ "عورت مزدوری کرتی ہے"۔ یہ سن کر گاؤں کے لوگ باتیں بنائینگے لیکن انھیں معلوم ہو تب نا؟ اتنے بڑے شہر میں کون کس کی خبر رکھتا ہے۔ اور پھر جان بھی جائیں تو کونسی بھاگوت اپوتر ہو جائے گی۔ کتنی ہی تو عورتیں اس کارخانے میں کام کرتی ہیں۔

رانی بھی ٹاٹ کے کارخانے میں بھرتی ہو گئی۔ ہفتے میں دو تین روپے لے مرتی ہے۔ شوہر بیوی کی ملی جلی آمدنی سے پانچ روپے گھر کا کرایہ اور خرچ چل جاتا ہے۔ جب کارخانے سے سستے داموں دال، چاول مل جاتا ہے۔ تو چلے گا بھی کیوں نہیں۔ مہینے میں دو ایک روپے بچ بھی رہتے ہیں! ایک مرتبہ مستری کے ہاتھ بارہ روپے گاؤں بھیجے گئے۔ کھیت نہ سہی گھر کی زمین کا سودا تو نہیں بڑھے دھیرے دھیرے ساری زمین چھڑائی جا سکتی ہے۔ یہی سوچ کر بیسو شہر آیا تھا۔

کارخانہ بند ہونے سے سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

کارخانے کے پھاٹک پر نوٹس لگ گیا "ہمارے اس ایک نمبر کے کارخانے کو سرکار نے اپنے کام کے لئے لے لیا ہے، اس لئے ہم کل مزدور مزدورنیوں کو جواب دینے پر مجبور ہیں۔ ہمارے کارخانے کی آمدنی بند ہو گئی۔ اس لئے سستے بھاؤ آٹا دال دینا مالکوں کے لئے ممکن نہیں۔ پھر بھی یہاں کے کچھ لوگوں کو ہمارے

دو نمبر کے کارخانے میں عارضی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ عارضی طور پر کام کرنا چاہیں۔ وہ اسی ہفتے دو نمبر کی مل میں جا کر نام لکھوا لیں ——"

بیسو ٹپڑھنا نہیں جانتا تھا۔ بیشتر مزدور نہیں جانتے۔ لیکن اسی دوران میں یہ خبر کارخانے بھر میں پھیل گئی، جیسے ضروری تار ہو۔ بیسو جب کام ختم کر کے شام کو کارخانے سے چلا۔ اس وقت تک وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ پھر بھی پھاٹک پر لگے ہوئے نوٹس میں لکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے حرفوں کی طرف وہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس میں سے حسبِ خواہش نئے معنی پیدا کرتا رہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا —— نہیں ہو سکتا۔ ڈیڑھ بات کی بات! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

پھاٹک سے تھوڑی دور پہ کوئی ڈھول بجا رہا تھا۔ میٹنگ ہو گی —— گول تالاب کے میدان میں، آج ہی، ابھی۔ ٹاٹ کا کارخانہ بند ہونے کے بارے میں۔ بڑے بڑے لیڈر آئے ہیں۔ ابھی چلو —— سب مزدور —— ابھی چلو...."

بیسو نے سردار لوگوں میں ایک مربی سے چلتے چلتے پوچھا —— "کس کی میٹنگ ہے جی؟ لال جھنڈے کی تو نہیں؟"

"ارے تھو ——! تمباکو تھوکتے ہوئے مربی نے کہا —— "کیا لال جھنڈا اب یہاں منہ دکھا سکتا ہے؟ سالا لوک کہتا ہے کہ دو نمبر مل ہی میں بدلی کا، کام کرو —— لڑائی کے لئے زیادہ ٹاٹ بناؤ —— اُس سے کیا ہمیں روٹی بھی ملے گی —— لڑائی کے لئے ہماری روٹی بھی گئی۔ لال جھنڈے والوں کو ادھر آنے پر مار بھگائیں گے۔"

بیسو کارخانے میں تھوڑے ہی دنوں سے کام کرنے لگا تھا۔ زیادہ سمجھتا نہ تھا۔ پوچھنے لگا "تب یہ کس کی میٹنگ ہے۔ کوئی لیڈر آئیں گے؟"

"—— بڑے بھاری لیڈر آئیں گے۔ صداقت حسین کا نام سنا ہے؟

وہ آئیں گے۔ بڑا بھاری آدمی ہے۔ لاٹ کی کونسل کا ممبر ہے، بہت زبردست، ہمارے لئے ایک قلم لکھ دیں گے تو لاٹ صاحب کو بھی ماننا ہوگا۔ سمجھا؟"

باتیں کرتے کرتے میٹنگ میں پہنچے۔ اس وقت میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔

صداقت حسین بول رہے تھے:۔

"خبردار! کوئی لال جھنڈے والوں کی چال میں نہ پھنسنا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ دو نمبر کی مل میں عوضی کا کام کرو۔ اور سبھی مل کر کام کے ہرجانے کی مانگ کرو ارے ایک بار عوضی کے کام پر چلے جانے سے کیا پھر سرکار ہرجانہ دے گی؟ کہے گی، کام تو مل گیا۔ اب اور کیا؟"

مرتی مزدور نے بلیسو کو کہنی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "سنا عوضی کے کام پر چلے جانے سے ہرجانہ نہ مل سکے گا۔ کام بند کرنے سے ——— ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھو۔ گھر بیٹھے سرکار روپیہ دے گی۔"

صداقت حسین آنکھیں نکال کر کہہ رہے تھے ——— "لال جھنڈے والے سرکار کے دلال ہیں! اسی لئے کہتے ہیں کہ عوضی کا کام کرو، جس سے سرکار کا پیسہ بچ جائے کہتے ہیں کہ جو لڑائی چل رہی ہے۔ وہ ہمیں بھی لڑنی ہوگی۔ ارے آج جو ایک نمبر کی مل سے ہماری روٹی گئی۔ وہ کس کے کارن؟ اسی لڑائی کی وجہ سے ——— اسی لئے سرکار نے مل لے لی ہے۔ ہماری روٹی چھن گئی۔ اس لڑائی نے ہی ہمارا ستیاناس کر دیا۔"

لیڈر کی کرسی کے پاس بہت سے لوگوں نے تالیاں پیٹیں۔ بلیسو نے لڑائی و لڑائی اتنی نہ سمجھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بات تھی! اس نے تالیوں کے شور میں پاس کھڑے ہوئے مرتی سے پوچھا۔ "ہرجانے کا روپیہ کتنے دنوں میں ملتا ہے؟ اگر سرکار نہ دے تو!"

مرتی اس وقت دھیان سے تقریر سن رہا تھا۔ بولا ——— "سنو نا حسین صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

صداقت حسین نے کہا ——— ہرجانہ نہ دے کر سرکار کہاں جائے گی، قانون ہے ——— پکا قانون، ——— کارخانہ لینے پر سرکار کو پورے ایک برس کی تنخواہ ہرجانہ میں دینا ہوگی۔ لاٹ صاحب کو بھی یہ قانون ماننا پڑے گا۔ پچھلی لڑائی میں نہیں دینا پڑا تھا؟ کوئلہ نہ ملنے پر جب کارخانہ بند ہوا تھا تو بھتہ اور رسد نہیں دینا پڑا تھا؟ اس دفعہ نہ دینے سے کس طرح پار لگے گا؟ گھر بیٹھ کر ہم روپیہ کمائیں گے۔"

اس بار چاروں طرف زور زور سے تالی بجی۔ گرم ہو کر صداقت حسین نے کہا ——— "سات دن کے اندر اندر سرکار سے روپیہ لے کر رہیں گے ضرورت پڑنے پر لاٹ کونسل تک معاملہ جائے گا۔ تم سب صرف ایکا کئے رہو۔ کوئی بدلی کے کام پر نہ جانا۔ اور سب چندہ ڈال کر فنڈ جمع کرو۔ معاملہ بڑا نازک ہے ——— بہت روپیہ لگے گا۔ اکٹھے ہو کر رہو۔ قانون ہے۔ روپیہ لیکر ہی چھوڑیں گے۔" ایک بار پھر زور زور سے تالیاں بجیں۔ جلسہ ختم ہو گیا۔ اٹھتے اٹھتے مرتی نے بیسو سے کہا۔ "سنا؟ آئین ہے ——— قانون! لاٹ صاحب کے باپ بھی نہیں روک سکتے۔ چلو چندہ جمع کرا دیں۔"

حسین صاحب کے ساتھیوں کی جھولی میں جھنڈ مزدور آ کر اکنی چونی اور کئی ایک روپیہ تک ڈال جاتے ہیں۔ بیسو نے بھی بھگوان کا نام لے کر سر سے چھو کر ایک دونی جھولی میں ڈال دی۔

ذرا جلدی کرو جس سے سات آٹھ دن میں ہی فیصلہ ہو جائے۔"

* * * *

——— ادھرم ہوتا ہے ادھرم! پرائے مرد کے ساتھ دھرم نشٹ کرنے سے نرک میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ پتی کے لئے ستی نے جان دے دی۔ پرائے مرد سے نہ بولی ——— رام رام وہ بات منہ تک لانا بھی پاپ ہے۔"

رانی من ہی من میں غصّے سے جل رہی تھی۔ سویرے سویرے وہ کلموا امیدی پھر آیا تھا۔ پندرہ دن تو بنا کام کے ہو گئے۔ رسد بند ہے۔ سرکار نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ چاول کب کا ختم ہو گیا۔ اب کب تک بھوکی رہے گی ——— مر کلموہے! ——— ہم بھوکے رہتے ہیں تو تیرا کیا۔ کتنے ہی لوگ تو سوکھ رہے ہیں ..... پر وہ کب دھیان دیتا ہے۔ کہتا ہے ——— میرے ساتھ چل، بچ بچ، سچ بچ میں دور کہیں چل کر کام تلاش کر لیں گے۔ میں سردار ہوں۔ مجھے کام کی کیا فکر؟ اور ہاتھ میں بھی تو کچھ ہے! ——— دور ہو ابھاگے!"

پھر بھی دل ڈانوا ڈول ہے۔ رانی پھر زور لگا کر سوچتی ہے۔ "اوہ! آدمی کی کیا مجال ہے۔ کہتا ہے، کھوکا کو گھر پر ہی چھوڑ کر میرے ساتھ چل، بھاگ چل اپنے کھوکا کو چھوڑ کر میں اس دشٹ کے ساتھ جاؤں گی؟ دور ہو بدذات، حرامی پلّہ کہیں کا!" ———

پھٹی چٹائی پر اٹھ کر بیٹھے ہوئے کھوکا کو وہ سینے سے پٹا لیتی ہے۔ "میرا ابھیّا ——— میرا لاڈلا، راجہ بیٹا!" پھر سوچتی ہے کہ چاول تو پانچ دن پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ایک روپیہ دے کر ایک سیر چاول خریدا گیا۔ وہ بھی کب آسانی سے ملتا ہے "باپ رے! ایک سیر چاول کا دام ایک روپیہ تو کبھی نہیں سنا تھا۔ ایک وقت آدھا پیٹ کھا کر ہی وہ چاول پرسوں ختم ہو گیا۔ کل ہرے مٹروں پر کٹی۔ مٹھی بھر باسی بھات

کھوکا کو ملا تھا۔ آج وہ بھی نہ ملا۔ ہائے رام۔ کیا بیتنے والی ہے؟

سات دن کے فاقے اور ادھ پیٹ کھانے سے بچے کے منہ پر پرچھائیں سی لگ گئی تھیں۔ پیٹ سوکھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ٹھن ٹھنا کر روتے بولا۔ "بھوک لگی ہے ماں! بھات دے!"

"—— میرے راجہ، میرے لال، نہ رو، ذرا صبر کر، باپ ابھی چاول لے کر آرہا ہے۔ گرم بھات کھانا بیٹا!"

"—— درم بھات نہیں۔ منہ دل دائے دا، ٹھنڈا بھات تھاں دے۔"

—— "اچھا، اچھا، ٹھنڈا بھات دیں گے۔ ذرا ٹھیرو۔ ابھی باپ آیا۔"

ٹھنڈا بھات پانے کی امید میں نہ جانے کیا سوچ کر بچہ چپ ہو گیا۔

بیسو گھر میں گھسا۔ سوکھا منہ دیکھ کر پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے رانی نے پوچھا "کیا ہوا؟ کچھ ہو سکا؟" غصّے سے بیسو نے چلّا کر کہا —— "ہو گا کیا، ہمارا سر؟ کیا کوئی کام لے کر بیٹھا ہے؟"

رانی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسے روک کر بیسو بولا "میری ہی نہیں۔ سب کی یہی حالت ہے۔ جتنے لوگ گھر بیٹھ کر ہرجانہ لینے کی سوچ رہے تھے۔ سبھی دو نمبر کی مل کے دروازے پر چکر لگا رہے ہیں۔"

اور لوگ بھی اسی کی طرح بے وقوف بنے ہیں۔ یہ سوچ کر دکھ میں بھی اسے اطمینان سا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آنے والا خشک سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ منیجر صاحب اور اس کے باپ کو بڑی بری گالیاں دے کر بولا —— "اوہ سالا کیسا خچر ہے۔ کسی کو بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ سات دن میں جو آیا اُسے کام دے دیا اب اور ضرورت نہیں ہے۔"

رانی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا —— "چاول بھی نہیں لائے؟ پرسوں رات سے

فاقہ چل رہا ہے۔ ہم نے تو کسی نہ کسی طرح سہہ لیا، پر بچّہ بچارا کیا سہہ سکے گا؟ "بچّہ ——— بچّہ ——— بچّہ۔ تیرے لئے بس کھوکا ہی ہے۔" بلیسُو یکبارگی چھوٹ پڑا ——— اُسے کیوں جنا تھا چڑیل؟ نمک دے کر مار نہ سکی؟ جتنی بھی آفت ہے سب ٹھونسنے کے لئے ہے۔" اور انگوچھے میں بندھی کنکنی کی پوٹلی زمین پر پھینک کر بولا ——— "یہ لے پیڑا بنا لبس!"

رانی چُپ ہو رہی۔ تھوڑی دیر بعد غصّہ کم ہونے پر بلیسُو نے کہا ——— "یہ آدھ سیر چاول ہیں۔ بہت کھوج کھاج کر ساڑھے چھ آنے میں ملے ہیں۔ کتنا ہی کہا۔ پر اس پنساری کے بچے نے کسی طرح بھی آدھ سیر سے زیادہ نہ دیا۔ خوب ہوشیاری سے روک روک کر خرچ کرنا۔ سمجھی؟ پونجی تو چک گئی۔ اس سے اتنے دن چلانا ہی چاروں طرف پریشانی ہے۔ گنگا کے دونوں کناروں پر دس دس کوس کے اندر ٹاٹ کے جتنے کارخانے ہیں۔ ان سب میں گھومتے گھومتے پیروں کی چمڑی گھس گئی۔ کون کام دے گا؟ ویسے ہی آدمی نہیں لیتے۔ اور پھر کوئلہ نہ ہونے کے کارن بہت سے کارخانے بند پڑے ہیں۔ مالکوں کو تو آج کل مزدور چھڑانے ہی سے لابھ ہے۔ سستے چاول اور آٹے میں روپیہ خرچ نہیں ہوتا۔"

بلیسُو پریشان ہو جاتا ہے۔ ایک پاؤ چاول میں دو کھانے والے ہیں! اور اس بچّہ بھی ——— پیٹ کا کونا بھی نہیں بھرتا۔ بلیسُو بولا "یہ بھات دو آدمیوں کے لئے؟ ہنڈیا دیکھیں؟ ہنڈیا میں ایک مٹھی اور بھی تو ہے۔ اسے لے آؤ، وہ کس کیلئے رکھا ہے چڑیل؟"

رانی گھبرا کر بولی ——— "ہائے ہائے وہ نہ لینا، کل بچّہ کھائے گا۔ بچارے کی ہڈی پسلی تو نکل آئی ہے۔ سویرے ایک مٹھی نہ ملنے سے بچے گا نہیں۔"

——— اوہو، بڑا نواب زادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے سب پیڑے لونڈی کے

گڑھے ہی میں جھونکتی ہے۔ اور ہمارے بدن سے تو کاتک کی شوبھا نکل رہی ہے نا؟ بھات نہیں۔ مانڈ[1] کھلا، مانڈ، سمجھی! بچّے پر بھات نہیں خرچ ہوگا۔"

یہ کہہ کر ہنڈیا پتّر پر الٹ لیتا ہے۔

اپنے ڈیڑھ مٹھی بھات میں سے آدھ مٹھی بھات رانی نے بچّے کے لئے پانی ڈال کر ہنڈیا میں چپکے سے رکھ دیا۔

پھر صبح ہوئی۔ بچہ ابھی تک سو رہا تھا۔ بیسُو باہر سے آکر بولا ـــــ آج آخری جتن کر دیکھیں۔ پانچ اسٹیشنوں کے پار جوکار خانہ ہے، وہ کھلے گا۔ دیکھیں اگر کچھ ہو سکے۔"

اچانک لڑکا اٹھ بیٹھا ـــــ "ماں بھوک! ـــــ ماں بھوک! کہہ کر ٹھنٹھنانے لگا۔ بیسُو نے زور سے ایک چانٹا لگا کر کہا ـــــ "سُسرے کے پیٹ میں جیسے راون کی چتا جل رہی ہے!"

لڑکا سسک سسک کر رونے لگا۔ رانی اسے کلیجے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

بیسُو گھر سے باہر نہ نکلا۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے بولا ـــــ اوہ بہت راستہ چلنا پڑے گا۔ اس پر یہ تیز دھوپ، لوٹتے لوٹتے شام ہو جائے گی پیٹ میں ابھی سے آگ جل رہی ہے۔ خالی پیٹ اتنا راستہ کیسے چلا جائے گا؟ ـــــ ارے کچھ گھر میں ہے؟

یہ کہہ کر وہ چوکے کی طرف چلا۔ گود سے گرتے گرتے بچے کو سنبھال کر رانی دوڑی ـــــ "وہ ذرا سا بھات ہے، اُسے نہ لو۔ چھوڑ دو۔ بچّہ مر ہی جائے گا۔"

---

[1] چاولوں کی پیچ۔

بچے سمیت رانی کو ڈھکیلتے ہوئے بیسو بولا ـــــ "ٹھیر حرامزادی!"
ہنڈیا کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کل بھات نکال لیا۔ اور چباتے چباتے
بولا ـــــ "لونڈے کے لئے بھات چرا کر رکھا ہے۔ بدذات۔ نمک تو دے نہیں
سکی۔ اب بھات کا پانی کھلا دے۔ اب بھات نہ کھلا پائے گی۔ سمجھی!"
لیکن مٹھی بھر بھات سے ہوتا کیا تھا؟ اس پر غٹ غٹ ایک لوٹا پانی
چڑھا گیا۔ باپ کو بھات کھاتے دیکھ کر لڑکا چپ چاپ تاک رہا تھا۔ جب دیکھا
کہ سارا بھات ختم ہو گیا ہے تو پھوٹ کر رو پڑا۔ رانی کی آنکھوں میں بھی پانی آ گیا۔
دن چڑھنے پر لڑکا روتے روتے جانے کب سو گیا۔ نیند میں کبھی کبھی اس
کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگتی۔
اُس دن رسوئی بنانے کو کچھ نہیں تھا۔ مالک مکان کہہ گیا تھا کہ آج کرایہ
نہ دو گے تو کل گھر سے نکال دوں گا۔ رانی بیٹھے بیٹھے سوچتی ہے۔ امیدی کل پھر آیا تھا
آخری بار کہتا تھا ـــــ دکھن کے کارخانے میں کام ملا ہے۔ کل وہاں چلا جاؤں گا
رانی چل میرے ساتھ چل۔ مرد اور بیٹے کو لے کر کیا کرے گی؟ وہ کیا کھانا دیں گے؟
ہم بچے رہے تو سب کچھ ہے، لونڈے کو چھوڑ کر میرے ساتھ چل۔
کل رانی اس کے منہ سے وہ کڑوی بات نہ ہو سکی۔ بن میں جیسے بل ہی نہ رہا
ہو، جاتے جاتے امیدی کہہ گیا تھا آنا ہو تو کل ہمارے گھر چلی آنا، اسی ٹیم سے
جاؤں گا۔
وہی "کل" آج آ گیا ـــــ
بیٹھے بیٹھے رانی سوتے ہوئے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی
ہے "پنجر کی ہڈیاں نکل کر جیسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہوں۔ چھاتی کی ہڈیاں
بھی جلدی ہی نکل آئیں گی ـــــ"

سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے من ہی من میں رانی کہہ رہی ہے ـــــ میرے کلیجے! میرے لال! چندا بیٹا ـــــ"

باہر سے آواز سنائی دی، رام نام ست ہے، دھیرے دھیرے اُٹھ کر رانی نے دیکھا۔ سڑک پر کسی بھاگوان کی ارتھی جا رہی ہے، مردنگ اور کھڑتال بج رہے ہیں۔ ارتھی کے آگے آگے کھیلیں پھینکی جا رہی ہیں۔ رانی نے جھانک کر دیکھا کھیلیں ہی نہیں پیسے بھی ہیں۔

رانی تیزی سے آگے بڑھی، پیسے ڈبل پیسے، اور اکنّی، ہاں وہی تو، پیسے آج کل کہاں ملیں گے؟

لیکن یہ بھیڑ کیسی ہے؟ اور پیسے بٹورنے کے لئے کیسی چھینا جھپٹی ہے رانی تھوڑی دور تک ارتھی کے ساتھ ساتھ چلی۔ پر اس بھیڑ میں سے پیسے اٹھانا عورتوں کے بس کی بات ہے؟

رانی ذرا رکی اور پھر پیسے بکھیرنے والے بابو کی طرف بڑھ گئی ـــــ بولی "بابو ایک پیسہ دونا!

بابو نے سر اٹھائے بغیر کہا ـــــ "دور ہو ڈائن! وہ سب لوگ جہاں سے اٹھا رہے ہیں وہیں سے اٹھا لے نا" ـــــ اس کے بعد منہ اٹھا کر دیکھا۔ رانی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھوں سے نظر، چہرے کی طرف بڑھی۔ پھر سارے جسم پر۔ کچھ تھوک نگل کر بابو نے کہا ـــــ "اچھا یہ لے"۔ اور اس کے ہاتھ پر اکنّی پھینک دی۔

دو پیسے والے کھیلوں کے دو چھوٹے ڈونے خرید کر رانی گھر لوٹی۔ اس وقت لڑکا جاگ کر رو رہا تھا۔ رانی ایک ڈونا لائی اور ایک لٹیا بھر کر بچے کے سامنے رکھ دی۔

اور دوسرا ڈونا رکھ کر رانی پھر سوچنے لگی۔

اُمیدی..... دکھن کا کارخانہ..... بچّہ..... شوہر..... فاقہ۔ دھرم
..... ادھرم..... بھات نہیں ہے۔ مانڈ بھی نہیں ہے۔ گاؤں کے کھیت میں
کتنی پیداوار ہوتی ہے۔ گاؤں کے مندر میں کتنا دھرم ہوتا ہے..... گاؤں
میں دھرم ہے۔ گاؤں میں بھات بھی ضرور ہی ہوگا....."

شام کو بیسُو لوٹا۔ سوکھا سا منہ لئے۔ فرش پہ ہی چت لیٹ گیا۔ اُسے
کام نہیں ملا تھا۔

کچھ دیر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ذرا دیر بعد کھیلوں کا ڈونا اور پانی کا لوٹا
بیسُو کے سامنے رکھ کر رانی بولی "اٹھو! ذرا پانی پی لو!"

کھیلیں؟ کھیلیں خریدنے کو پیسہ کہاں سے ملا؟ شبہ سے بیسُو چنچل ہوا اٹھا
چٹریل لکڑی کے صندوق کی معمولی پونجی تو کہیں ختم نہیں کر رہی ہے! کھیلوں کا قصّہ
رانی سناتی ہے تو بھی یقین نہیں آتا۔ کمر ٹٹول کر تالی دیکھی، ٹھیک ہے۔ ہاتھ بڑھا کر
صندوق کا تالا چھو کر دیکھا ——— ٹھیک ہے۔ عجیب ہے۔ اٹھ کر کھیلیں چباتا ہے
من کچھ بیٹھا جا رہا ہے ——— "تو نہیں کھائے گی؟"

"مَیں کھا چکی ———" یہ کہہ کر رانی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پیٹھ پہ ہاتھ
پھیرتے پھیرتے بولی ——— "سنو ہم لوگ گاؤں لوٹ چلیں"۔

——— "گاؤں؟ سُنا ہے۔ وہاں بھی تو بھات کا کال ہے۔ جانے
کون اُس دن کہہ رہا تھا۔"

——— "ہوگا۔ پر یہاں کی طرح روپے سیر چاول کبھی نہیں ہوگا۔ ہماری زمین
میں، آڈس دھان، نہ ہوا ہو۔ پر سنا ہے اور لوگوں کے یہاں اچھی فصل ہوئی ہے
گھر گھر محنت کر کے کیا دو مٹھی بھات نہیں ملے گا؟"

——— "وہ تو ٹھیک ہے۔ پان سات مہینے سے کُسین کی بھی کوئی خبر نہیں ملی

آمن کی فصل کیسی ہوئی؟ مہاجن کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔"

"—— دیور تو لکھنا پڑھنا جانتے نہیں کہ چٹھی لکھتے۔ سب ٹھیک ہوگا۔ کچھ گڑبڑ ہوتی تو ضرور خبر ملتی۔ بدشگونی کی خبر ہوا سے تیز چلتی ہے۔"

بلیسو ہچکچاتے ہوئے بولا "اس سے تو یہی اچھا ہے کہ کلکتے جا کر کام تلاش کیا جائے۔ سنا ہے وہاں کنٹرول کی دوکان پر چھ آنے سیر چاول ملتا ہے اور تھوڑی بھیک بھی تو مل سکتی ہے ——"

"—— چل ہٹ، ہم کیا بھکاری ہیں۔ اور پھر کلکتے میں چاول کے کنٹرول کی بات نہ کہو —— رام پریت کی بوا ایک دن گئی تھی۔ ساری رات اور سارا دن بیٹھے رہنے پر بھی (اگر تقدیر اچھی ہو) تو ایک آدھ سیر چاول ملتا ہے اور اسی کیلئے بیٹھے رہو گے تو کام کب ڈھونڈو گے؟ کہاں رہیں گے؟ اس ذرا سی پونجی سے کتنے دن چلے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ——" کچھ سوچ کر بلیسو پھر بولا —— ہاں تو یہ اسوج ختم ہو رہا ہے، اگھن تک کسی طرح قریب ڈیڑھ مہینہ کاٹ سکیں تو اس کے بعد ہماری ہی زمین میں دھان ہو جائے گا۔ تب کیا مہاجن ان تھوڑے سے دنوں کے لئے دھان ادھار نہ دے گا۔"

"—— ہاں نہ ہو تو کچھ کام ہی دے گا۔ ادھ پیٹ ہی رہ جائیں گے جیسے رہتے ہیں اس سے تو کہیں اچھا ہوگا۔"

بلیسو من ہی من میں حساب لگاتا ہے۔ لکڑی کے صندوق میں رکھی ہوئی تھیلی میں مصیبت سے جمع کئے ہوئے نو روپے ساڑھے چھ آنے ہیں۔ دو ٹکٹوں کا دام بارہ بارہ آنے کے حساب سے ڈیڑھ روپیہ ہوگا۔ ارے نہیں بہو کا ٹکٹ خریدے بغیر ہی کام چل سکتا ہے۔ زنانہ ڈبے میں بٹھانے سے کام چل جائے گا۔

"——— اچھا چلو چلیں۔ یہ گھر تو کل ویسے ہی چھوڑنا پڑے گا۔"

* * * *

جب وہ گاڑی سے اترے تو گیارہ کا عمل ہوگا۔

سٹیشن سے آگے سات کوس کا راستہ تھا۔ بیچ میں چار پانچ گاؤں تھے اور پھر ان کا گاؤں باجی پور تھا۔

بلیسُو جوان ہے، مرد ہے، تیزی سے بڑھا چلا جاتا ہے۔ لیکن رانی بچے کو گود میں لے کر نہیں چل سکتی۔ بچھڑ جاتی ہے۔ بلیسُو دور سے غرّاتا ہے ——

"کیوں ری! چلا نہیں جاتا؟"

رانی جواب دیتی ہے ——— "بچّہ گود میں لے کر جلدی چلا جاتا ہے کیا۔ دھیرے دھیرے چلو ———"

"اُس بچے کو لے کر ہی مَتی ہو نا۔" یہ کہہ کر بلیسُو اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہانپتے ہانپتے رانی کسی طرح چلی جا رہی ہے۔ سورج ٹھیک سر پہ تھا۔ اسوج کی تیز گرمی آسمان صاف۔ دھوپ سیدھے آکر جیسے جکڑنے لگتی۔ سارے بدن سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگتیں۔ خشک راستہ اور دُنیا بھر کی دھول ——— پیاس سے گلا سوکھ رہا تھا۔

سٹیشن سے نکل کر وہ اکیلے ہی چل پڑے تھے۔ کبھی کبھی دوسری طرف سے لوگ آتے دکھائی دیتے۔ پر مرد کوئی نہیں ——— عورتیں ہی عورتیں ——— کسی کی گود میں بچّہ ہوتا۔ اور کوئی بچّوں کا ہاتھ پکڑے گھسیٹتے گھسیٹتے، پاس سے نکل جاتی اکیلی کوئی نہیں۔ دو دو تین تین کی ٹولی میں ———

وہ لوگ ڈھیلے پیروں سے چلتے۔ جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہ ہو۔ یا جیسے کہیں بہت دور جانا ہو۔ دیکھنے سے یہی نظر آتا تھا۔ جیسے بہت تھک گئے ہوں

اگر وہ ذرا رک کر سوچتے تو سمجھ سکتے کہ ان کی یہ تھکن بہت دنوں کی ہے، جو دور چلنے سے نہیں، بلکہ فاقے کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ گھسٹتے آتے ہیں۔ پر رکتے نہیں جیسے رکتے ہی آگے نہ چل سکیں گے۔

بیسُو تھوڑا آگے ہے اور رانی ذرا پیچھے، کچھ دیر بعد صرف دو عورتوں کو تنہا آتے دیکھ کر بیسُو نے ذرا رک کر پوچھا ــــ "بوا کہاں جاؤ گی؟"

کسی قدر بے تاب سی ہو کر دونوں عورتیں پہلے رکیں اور پھر بولیں ــــ "کلکتہ جائیں گے، کلکتہ!"

بیسُو نے کہا ــــ "کلکتہ؟ معلوم ہوتا ہے وہاں تمہارے کوئی سمدھی ہیں۔"

بیسُو کی پھٹے دل صورت اور رُوکھے چہرے نے ان عورتوں کی بھیک مانگنے کی امید توڑ دی۔ مایوس ہو کر پاؤں بڑھاتے ہوئے بولیں "نہیں! کلکتہ میں کھچڑی کا لنگر کھلا ہے نا، وہیں جا رہے ہیں۔"

بیسُو کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ آگے بڑھ گئیں۔

رانی نے دھان کے کھیت دیکھے تھے۔ راستے میں کتنے ہی سن کے پودے تھے۔ جن کے سروں پر سفید سفید پھول تھے۔ اُن کے بعد ہی کھیت تھے ایک کے بعد دوسرا کھیت، یہاں سے آسمان تک اس بھاگا دوڑی میں سب گھل مل گئے تھے۔

آمن فصل کا دھان ہے۔ چارہ کتنا اونچا ہوگا؟ گھٹنوں تک، نا، کمر سے اونچا ہوگا۔ دو ایک پودوں میں دھان کی بالیاں بھی نکل آئی ہیں۔ پھر بھی ہری ہیں، کھانے لگیں تو ختم نہ ہو۔"

اتنا دھان، باپ رے باپ! کتنا چاول ہوتا ہوگا۔ دن کے بعد دن مہینے کے بعد مہینا، کھاتے ہی رہیں۔ پھر بھی ختم نہ ہو۔ اوہ کیسی بھوک لگی ہے۔ پرسوں رات سے تو پیٹ میں کچھ گیا ہی نہیں، اس پر پیاس۔ لڑکے کو پکڑے پکڑے بایاں ہاتھ

سُن ہو گیا ہے، کیا دھوپ کی تیزی آج کم نہ ہو گی؟ اگر ذرا سا پانی مل جاتا تو ہاتھ ہی سیدھا کر لیتے۔

اچانک بلیسُو کا دھیان ٹوٹا۔ پوچھا ——— "ارے ہاں، لنگر کیا ہوتا ہے۔ معلوم ہے؟"

"——— کھچڑی کا لنگر نا؟ لنگر، ناؤ کا لنگر تو نہیں۔"

بلیسُو سوچتے سوچتے کہتا ہے "اری ہٹ! وہ ہوتا۔ تب تو سمجھ ہی جاتا موت پڑے۔ اچھا اب پیر بڑھائے چل!"

——— ذرا سا پانی نہیں مل سکتا؟ بڑی پیاس لگی ہے۔"

——— "مرگئی! عورتوں کے ساتھ راستہ چلنا حرام ہے۔ ذرا سا چلیں اور پانی۔ اس کے بعد کہے گی بھات چاہیئے۔ سونے کے لئے بچھونا چاہیئے۔ واہ رے شوق، چل چل سیدھے گھر پہنچ کر پانی پینا۔"

تھوڑی ہی دور پر گلا سوکھنے لگتا۔ بار بار ٹال نہ سکنے پر بلیسُو بولا

——— "اچھا، اس سامنے کے گاؤں سے ہو کر چلیں۔ وہاں پانی ملے گا۔"

تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ پورا گاؤں دکھائی نہ دیتا تھا نیچے اترنے پر کھیت کے بائیں طرف بانسوں کے جھرمٹ کے پاس تھوڑے سے گھر دکھائی پڑے۔

——— اور بھی نزدیک، ایک احاطے کے بیچ میں تین چار جھونپڑے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بانس باندھ کر الگ کئے گئے ہوں۔ اس وقت صرف دو چار بلیاں کھڑی رہ گئی تھیں۔

احاطے کے سامنے بانس کے پیڑ کے نیچے آ کر بلیسُو بولا۔ "تو ذرا یہاں ٹھہر، میں پکار کر دیکھوں۔

کھوکا کو زمین پر اتار کر رانی ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی، بیسو نے بڑھ کر آواز دی ــــ "کوئی ہے..... ذرا سنو!"

کوئی جواب نہ ملا۔ شاید سو رہے ہوں۔ یہ سوچ کر بیسو کھانستا کھانستا پہلے جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔

(۱)

ڈیوڑھی سے کوٹھڑی اور آنگن وغیرہ گھر کی سب چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت دنوں سے اس گھر میں کوئی آدمی نہیں رہتا۔ دروازے کے ٹھیک اوپر چھپر میں چھید ہو رہا تھا۔ چھید میں سے برسات کے پانی نے ٹپک ٹپک کر ایک گڑھا سا بنا دیا تھا۔ کئی دنوں سے پانی تو نہ برسا تھا لیکن یہ گڑھا پانی سے بھرا ہوا تھا۔ چھید میں سے دھوپ کی ایک کرن پانی پر تھرک رہی تھی۔ بیسو نے غور سے دیکھا کہ مکان خالی ہے۔ فرش پر دھول کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ ایک طرف گھڑا الٹا پڑا ہے۔

"اس گھر میں آدمی نہیں رہتے۔" بڑبڑا کر بیسو نے پڑوس کے جھونپڑے پر جا کر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پہلے جھونپڑے کی طرح یہ بھی اجاڑ پڑا تھا۔

بیسو اور آگے بڑھا، ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں سارا احاطہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ عجب گھٹا گھٹا سا ماحول ہے۔

بیسو کا دل دھڑکنے لگا "کیا بات ہے؟ اس گاؤں کے سب لوگ مر گئے کیا؟" وہ ذرا اور آگے بڑھا۔ تو اسے ایک اور گھر نظر پڑا۔ دوسرے گھروں سے بہت بڑا، اور ڈیوڑھی پر گھر کے دو دروازے ہیں، چھت بھی پھوس کی نہیں، خالی کنستروں کے ٹین جوڑ جوڑ کر تیار کی گئی ہے۔ وہاں آدمی ضرور ہے۔ بیسو آگے بڑھ گیا۔

ٹین میں زنگ لگ گیا تھا۔ اس پر ہاتھی مار کر نشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیوڑھی کی

چھت میں ایک جگہ ٹین کی کمی کو پھوس سے پورا کیا گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے آکر بلیسو سوچنے لگا کہ یہاں ٹھیرے یا نہ؟ وہ ایک بار زور سے کھانسا۔ گھر کے دروازے میں سے کوئی پھرتی سے نکل بھاگا۔ کُتّا ہے کیا؟ نہیں گیدڑ ہے!

بلیسو ذرا سہم گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ڈیوڑھی پر چڑھ کر اندر جھانکا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اندر بانس کی کھاٹ کے اوپر میلی گدڑی میں ایک آدمی پڑا تھا کیسی بدبو آئی تھی بھک سے۔ ناک پھٹنے لگی۔ سر نکال کر سانس بند کرتے ہوئے بلیسو نے پھر دیکھا۔

"مر گیا ہے، مر گیا ہے..... زندہ آدمی نہیں۔ لاش ——— منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ایک پیر کھاٹ سے نیچے جھول رہا ہے۔ جیسے کسی نے چبا ڈالا ہو.....

زور کی ہوا سے دور کوئی دروازہ یا کھڑکی کھٹ سے بند ہوئی۔ ہوا کے تھپیڑے سے بانس کا پیڑ کڑکڑانے لگا۔

بلیسو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رام رام۔ ہائے رام، الٹے پاؤں بھاگا۔

"——— چل چل اٹھ جلدی چل"

"——— کتنا وقت ہو گیا۔ پانی کیا ہوا جی؟"

"——— چل، چل بھاگ! اس گاؤں میں موت کا راج ہے۔ آدم ذات نظر نہیں آتے رام! رام!! رام!!! اُٹھ چٹ پٹ چل! اب گھر پہنچ کر ہی پی لینا ———

——— اور دونوں پھر چلنے لگے۔

(۲)

باجی پور پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ بھوکے پیاسے وہ کہیں نہ ٹکے۔

گاؤں میں گھس کر اور کسی کی تلاش نہ کی۔

گاؤں کے سرے پر ہی گھر تھا سیدھے چلے آئے۔

شام کا وقت ہے۔ پر کہیں سنگھ نہیں بجتا۔

کُسِن کُسِن پکارتے ہوئے ہابیسُو جھونپڑے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ باپ رے! چبوترے کا کیا حال ہے۔ ادھر ادھر گھاس ہی گھاس۔ پودے! ڈیوڑھی میں بھی دوب اگ رہی ہے۔

رانی بولی ——— "ہائے میرے بھاگیہ! سہجن کے دونوں پیڑ اس طرح کس نے سونت لئے؟ ایک پتّا بھی نہیں!"

کُسِن کا کوئی پتہ نہیں۔ ہابیسُو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے سب گاؤں خالی ہو گیا ہو۔ آدمی نہیں لاش۔ ڈیوڑھی پر رُک کر وہ رانی کا انتظار کرنے لگا اکیلے اندر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ اندر اندھیرا تھا، دیا سلائی جلا کر اچھی طرح دیکھا۔ یکایک روشنی دیکھ کر ایک چمگادڑ خوف سے اڑ گئی ———

گھر کے اندر وہی پہلے کا سا حال۔ جو پچھلے گاؤں میں دیکھ آئے تھے۔ دھول، کوڑا، اور ٹوٹے پھوٹے برتن۔ آدمی کا نام نہیں۔

رانی بولی۔ "کیوں جی دیورا بھی تک گھر نہیں آئے؟ لیکن گھر کی یہ حالت کس نے کی؟ کچھ بھی نہیں یہاں ——— جیسے کوئی رہتا ہی نہ ہو۔"

ڈرا ہوا سا ہابیسُو بولا۔ "موت چھا رہی ہے رے ——— یہاں بھی موت ..... گاؤں بالکل خالی ہو گیا، اس طرح کی غریب بستی میں ڈھونڈنے سے دو ایک آدمی ہی مل جاتے۔ ابھی موت نے اُن کو چنا نہیں تھا۔ یا شاید ان کے پاس زیادہ پونجی تھی۔"

بہت تلاش کرنے پر موکشدا بوا ملیں، تھوڑا تھوڑا انجار تھا۔ بدن ایک چیتھڑا لپٹا ہوا تھا۔

بوا سے سب حال معلوم ہوا۔ "کُسن؟ اس نے تو مہینہ ہوا گھر چھوڑ دیا۔ اس بستی کے سبھی لوگ بھاگ گئے۔ موت؟ نہیں..... ہاں موت ہی تو ہے بھوک۔ گاؤں میں اور کتنے دن رہ کر لوگ سوکھیں گے۔ بھات کے بدلے گھوئیاں کے پتے۔ سہجن کے پتے! وہ بھی ختم ہو گئے۔ جوان مرد، بیٹیا، بچے سبھی تو ایک ایک کر کے کھسک گئے کہاں گئے؟ کسے پتہ؟ شاید شہر میں بھیک مانگتے ہوں، نہیں تو کسی دور دیش میں کسی ڈگر پر پڑے، مر رہے ہوں گے۔ اب سب عورتیں بھی کلکتے جا رہی ہیں۔ وہاں شاید کھچڑی کا لنگر کھلا ہے۔

"یہ کیا سچ بات ہے۔ پتہ ہے تمہیں؟"

تمہارا کُسن؟ ہاں اچھی طرح معلوم ہوا۔ ٹھیرو وہاں یاد کرتی ہوں۔ اچھا ہاں ——— وہ تو بعد ہی میں گیا۔ جو مہاجن شاہ جی ہیں ——— کل آمن فصل اسے لکھ کر کچھ چاول ادھار لیا تھا۔ اسی سے کچھ دن گزارے۔ پر اس سے کتنے دن نکلتے؟ اور پھر شاہ بھی کیسا ہے کہ ایک بار لکھا پڑھی ہو گئی تو اس کے بعد مٹھی بھر بھیک بھی نہ دی۔ آمن فصل تیار ہو گی۔ تو سب اسی کی ہو گی۔ اس نے کچھ نہ دیا۔ سات دن میں کُسن بالکل سوکھ گیا۔ مگر شاہ کو دیا نہ آئی۔ سات دن بعد دیکھا کہ کُسن بھی روانہ ہو گیا ہے۔ کون جانے کدھر گیا۔ شاید تمہاری ہی کھوج میں گیا ہو۔

شاہ جی؟ رام رام وہ کیوں جانے لگیں۔ ان کے تو پو بارہ ہیں۔ گھر میں دھان بھرا پڑا ہے۔ اب پولیس تلاشی لینے آئی ——— تو سب کچھ سمدھیوں کے گھروں میں چھپا دیا۔ دونوں ہاتھوں سے روپے بٹور رہے ہیں۔ میرے پاس سونے کی چوڑی رہ گئی ہے۔ سہاگ کی نشانی سمجھ کر اسے نہ چھوا تھا۔ چھوٹا بھاگ، کہ یہ چوڑی بھی،

شاہ جی کو دے کر دھان لے آئی۔ اب اس کے بعد کیا ہو گا؟"

ہاتھ پیر پیٹ میں گھسے جا رہے ہیں۔ بلیسو کا پاؤں تھرتھرانے لگا۔ رانی کھوئی کھوئی یوں دیکھ رہی ہے۔ جیسے گھر بار سب اس پر ڈھے پڑا ہو۔ بچہ رو رہا ہے لیکن اسے اس کا کوئی دھیان نہیں۔

دونوں گھر کی ڈیوڑھی پر بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ من میں کتنی ہی باتیں اتھل پتھل کر رہی تھیں۔ پر ان کا انت کہیں نہ تھا ـــــ کہیں پہنچتی ہی نہ تھیں۔ صرف چکّر کھا کھا کر پاگل کئے دیتی تھیں۔ من کہتا تھا۔ نہیں، نہیں، نہیں! جیسے کسی کا اکیلا کماؤ بیٹا مر گیا ہو۔

اندھیرے میں لمبی سانس لے کر بلیسو بولا ـــــ "اچھا تم ٹھیرو، میں ایک بار شاہ جی کے یہاں دھرنا مار کر دیکھتا ہوں، کچھ ڈر نہیں۔ کہیں کچھ ہوتا ہے؟"

رانی کے من میں اچانک ایک ڈر پیدا ہو گیا۔ کیسا ڈر؟ یہ وہ اس وقت ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اکیلی ہے، بالکل اکیلی جھٹ منہ سے یہ آواز نکلی ـــــ "ہمیں اکیلے چھوڑ کر مت جاؤ! ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

کھوکا پھر ٹھنٹھنانے لگا۔

بلیسو کے من میں بھی ڈر پیدا ہوا۔ بالکل رانی کے ڈر کی طرح۔ جیسے چھاتی پر بڑا بھاری بوجھ ہو اور بغیر ہٹائے سانس لینا بھی مشکل ہو۔ ایکا ایکی چیخ کر بولا۔ "مر چڑیل! تو کہاں جائے گی! الگ بیٹھ میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں۔

لیکن رانی کب چھوڑنے والی تھی، اٹھ کر ساتھ چلنے لگی..... مہاجن کی بیوی نہ تھی اس لئے اس کے دل کی بھگتی جاگ اٹھی تھی وہ "موندرا" کا پاٹھ کر رہا تھا ـــــ "کے تو مارا استری آر کے دا پتر مارے ای سنسار

ہائے بڑ دای وچتر۔"[1]

ان لوگوں کے پکارنے پر وہ باہر آیا "کون ہے؟ اوہ بیسو! اس وقت مرتے گاؤں میں کیوں آیا؟ کام چھوٹ گیا ہے؟ ارے گدھے وہیں رہ کر کسی دوسرے کام کا جتن کیا ہوتا۔"

"سنا ہے ٹاٹ کے کارخانے میں بڑا روزگار ہے۔ وہاں سے کچھ لائے بھی ہو؟ کئی مہینے ہوئے تم نے تھوڑے سے روپے بھیجے تھے۔ اس کے بعد تو ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ اس مہنگائی کے بازار میں ہمیں بھی تو رہنا ہے....."

پاگل تو نہیں ہے، کہتا ہے چاول دو! کوئی چاول رکھنے کا زمانہ ہے۔؟ پولیس نے آکر گھر سے چھین لیا ہے یا نہیں، دور دیکھتے ہوئے شاہ جی نے پھر کہا ——— تیرے ساتھ اور کون ہے رے؟ اوہ تیری گھر والی ہے، پورے کنبے کے ساتھ آیا ہے۔ اس بار گاؤں میں کوٹھا بنائے گا یا نہیں؟

اپنی رنگیلی طبیعت پر خوش ہو کر مہاجن نے ایک بار پھر رانی کی طرف دیکھا۔

ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا ——— روشنی کی دو ایک کرنیں جھروکے سے نکل کر اس اندھیرے پر پڑ رہی تھیں۔ چھوٹے دوپٹے کا گھونگٹ نکالنے سے چھاتی سے کپڑا اٹھ گیا۔ اس پر کم روشنی اور زیادہ اندھیرے کی وجہ سے چھاتی کا ابھار اور بھی اونچا اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوب بھری ہوئی ہیں۔ فاقے سے گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ لیکن اندھیرا ان گڑھوں کو پُر کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا گال خوب گول مٹول ہیں۔

شاہ، بے صبری سے بولا۔ "اچھا کل آنا تب دیکھیں گے کیا کر سکتے ہیں۔"

---

[1] کون تمہاری بیوی ہے اور کون تمہارا بیٹا۔ یہ سنسار بڑا عجیب ہے۔

دوسرے دن سویرے پھر شاہ جی کے ہاں۔ اب کے بیسُوا اکیلا تھا۔ شاہ اکھڑ آدمی تھا۔ "دھان وان تو دے نہ سکیں گے بھائی! آں ہاں! ایک مٹھی بھی نہیں۔ زمین میں آمن دھان ہوا ہے۔ پر اس میں تمہارا کیا؟ اس کی تو کُسن کے ساتھ لکھا پڑھی ہو گئی ہے۔ نہیں تو کھاتا کیا؟ گھر میں جو کچھ تھا۔ وہ تو پہلے ہی گڑھے میں ڈال چکا تھا۔ اب اس کے بعد پورے دو مہینے کھلایا۔ بازار میں بیچنے سے کتنا روپیہ ملتا۔ وہ لونڈا ایسا نمک حرام ہے۔ جاتے وقت پرنام کر کے بھی نہیں گیا۔ اس کے بعد منت سماجت، پاؤں پکڑ کر رونا دھونا، پر کسی سے کچھ لابھ نہیں۔ کچھ سوچ کر، جیسے محبت سے اسے ممنون کرنے کے لئے شاہ جی بولے ——— "دھان تو دے نہ سکوں گا بھائی صاف بات ہے۔ پر تم پرانی آسامی ہو۔ ایک راستہ بتائے دیتا ہوں زمین تو تم اگلے جنم تک بھی نہ چھڑا پاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ زمین کی کُل لکھا پڑھی میرے نام کر دو۔ دس روپے نقد دیدوں گا۔"

——— "روپے لے کر کیا کروں گا؟ کھیتی ہی کا ایک سہارا ہے۔"

——— "ارے تو مرد بچہ ہے جوان! روپے لے کر کلکتہ چلے جاؤ۔ بڑا شہر ہے۔ وہاں بہت سے کام ہیں، اخبار میں لکھا ہے کہ وہاں لنگر بھی کھلا ہے۔ بنا پیسے کے کھچڑی کھانے کو دیتے ہیں۔ کچھ پلّے نہ رہا تو کھچڑی تو مل جائے گی۔"

بیسُو کی بیوی بچے کے خیال سے ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔ اسے اٹھا کر تو کلکتے جایا نہیں جا سکتا۔ کہاں رکھے گی؟ کیا کھلائے گی؟"

شاہ جی اور جوش سے بولے "عورت کی کیا چنتا کرتے ہو۔ زندہ رہنے پر عورتوں کی کمی ہے؟ گاؤں کے سب مرد تو بھاگ گئے۔ اپنی بستی میں ایک بھی مرد بچّے کو دیکھا ہے۔ جب انھیں کچھ چنتا نہیں ہوئی تو تمہیں ہی ایسی کیا فکر پڑی ہے؟"

بلیسُو کا من بھرا جا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر شاہ جی جھٹ پٹ بولے۔

——— "چل چل اٹھ! کام جتنی جلدی کیا جائے اتنا ہی شبھ ہے۔ آج ہی لکھا پڑھی ——— رجسٹری کرلی جائے۔ پانچ گاؤں کے اس پار رجسٹری آفیسر کے پاس، اٹھو، ابھی چلو!

دونوں مل کر چل دیئے۔

رات کو بھی بلیسُو گھر نہ لوٹا۔ رانی کو نیند نہ آئی۔ ایک بار باہر آ کر دیکھا کہ بلیسُو لوٹا یا نہیں۔ پھر کھوکا کے پاس بیٹھے بیٹھے رتجگے ہی میں رات گزار دی، ادھر کئی دنوں سے کچھ کھایا نہیں۔ ادھر چنتا اور ڈر۔ کیا سچ مچ بلیسُو مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا؟

سویرا ہوتے ہوتے وہ شاہ جی کے گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں آدمی آتے ہیں تو دور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بلیسُو ہے۔ جھپٹ کر آگے بڑھتی ہے اور پاس آنے پر بھوت معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ جی بولے ——— میں کیا کروں، میں نے تو منع کیا تھا کہ عورت اور بچے کو چھوڑ کر کہاں جائے گا؟ پر وہ ابھاگا کچھ سنتا بھی؟ جانے کدھر چلا گیا؟ کہتا تھا اب گاؤں نہیں لوٹوں گا۔ پھر ذرا رک کر بولے ——— "اس کا سبھاؤ ہی ایسا ہے۔"

اندھیرا ——— چاروں طرف اندھیرا، رانی کو ایسا معلوم ہوا جیسے اچانک کسی چیز سے زور کے ساتھ ٹکر لگی۔ پورا سر چکرا گیا۔ دونوں پیروں اور جسم کا بوجھ سنبھالا نہ جاتا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں کہ وہ کب اور کیسے شاہ جی کے گھر سے راستے پر آ پہنچی۔

اندھیرا ——— چاروں طرف اندھیرا، کہیں بھی کوئی آشا نہیں۔ کوئی سہارا نہیں۔ موکشدا بوا سن کر بولیں ——— میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔ ایک بھی لڑکا گھر میں

سنا ہا۔ دیکھ لینا اب بیسو نہیں لوٹے گا۔ یہ کہتے کہتے بوا نے جھٹ دروازہ لگا دیا۔ رانی دودھ دانے چاول کی امید پر باہر بیٹھی رہی۔

کوئی آس نہ رہنے پر بھی رانی دوبارہ سارا گاؤں گھوم آئی کہ بیسو کہیں ادھر ادھر نہ بیٹھا ہو؟

دن بیتتا ہے۔ پھر سویرا ہوتا ہے، فکر تو ہے ہی، پر اسے پیٹ کی جوالا جھون رہی ہے۔ فاقہ کرتے کرتے کتنے دن بیت گئے۔ لڑکے کی چھاتی اور پنجر کی ہڈیاں سب باہر نکل آئیں۔ اپنے پیٹ میں بھی جانے کیسا درد سا ہے۔ جیسے پیٹ اور پیٹھ ایک ہو گئے ہوں ـــــ کڑوا کڑوا سا لگتا ہے۔ گیلا گیلا سا۔ برابر ال بہتی رہتی ہے۔

ایک دن شاہ جی کے ہاں مٹھی بھر چاول کے لئے گئی۔ انھوں نے بھگا دیا بولے ـــــ "خبردار، اس گھر کی طرف نہ آنا۔ یہاں کیا مچھر کی طرح بھنبھنا رہی ہے بیسو حرامزادہ ذرا سی زمین کے لئے کھرے کھرے اتنے روپے لے گیا۔ پالاگن کے نام پر بھی ایک روپیہ واپس نہ کیا۔ اور اب ان کی رانی جی آئی ہیں، چاول دو! چل ہٹ چڑیل، کہیں اور جا کر مانگ!"

بھیک ہی کے لئے کیا کم گھومی پھری، اپنے گاؤں ہی میں نہیں، آس پاس کے دیہات میں بھی ـــــ دروازے پر ہاتھ پھیلاتی رہی، ہائے رام! ہڈیوں کے ڈھیر بچے کو دیکھ کر بھی کسی نے مٹھی بھر بھات نہ دیا۔

چھاتی میں ذرا بھی دودھ نہیں۔ پھر بھی وہ انھیں بار بار بچے کے منہ میں ٹھونستی جاتی۔ بچہ چپ نہ رہتا۔ زور سے رونے کی طاقت اب اس میں نہ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے روتا تھا۔ چھاتی دانت سے کاٹ لیتا۔ بڑا بھیانک لگتا۔

کچھ دیر چپ کرانے کے لئے خالی پانی زبردستی پلا دیا تھا۔ خالی پیٹ اسے کیسے پچتا؟ پھٹ سے قے ہو گئی۔

پھر بھی بھیک کے لئے راستے راستے گھومتی ہے اور سوچتی ہے کہ بلیسو تو چلا گیا ..... اگر امیدی ہوتا تو کیا وہ بھی ایسی مصیبت میں بھاگ جاتا؟ شاید نہ بھاگتا، کہاں گیا؟ دکن کی کس مل میں؟ اگر معلوم ہوتا ——— تو ذرا سے بھات کے لئے سوچنا نہ پڑتا

راستے راستے بھیک مانگتی ہے۔ اکثر کچھ نہیں ملتا۔ بیشتر لوگ تو گھوم کر دیکھتے بھی نہیں۔ کہیں ایک آدھ آدمی ایک ادھنی پھینک دیتا ہے۔ بھات کوئی نہیں دیتا۔ ہائے رام! ادھنی سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے تو کوئی ایک مٹھی چاول بھی نہیں دے گا۔

کبھی کبھی دو ایک آدمی جانے کس طرح چاروں طرف دیکھ کر کھسر پھسر کرتے ——— ہمارے ساتھ چل، بہت سا بھات ملے گا۔ پر وشواش نہ آتا، حوصلہ بھی نہ پڑتا۔

——— تھک ہار کر رانی گھر واپس آ گئی۔ بھوک کی شدّت سے روتے روتے لڑکا سو گیا تھا۔ اسے گھر میں سُلا کر بے بسی کی حالت میں وہ چوکھٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

آسمان میں کئی رنگ گھلے ہوئے ہیں۔ لال اور پینگنی، اور نہ جانے کتنے ملے جلے رنگوں میں دن ڈوب رہا تھا۔ اس کا من بھی تو ڈوب رہا تھا۔

من کہتا۔ نہیں، نہیں، نہیں، کچھ نہیں، آشا نہیں، بھروسہ نہیں ——— کیسے بچے گا؟

نہیں، نہیں، گاؤں میں بھات نہیں ہے۔ اور دھرم نہیں ہے، دھرم کا بندھن تڑوا کر وہ بھی بھاگ گیا۔

بھوک رہ رہ کر پیٹ میں اینٹھن پیدا کرتی ہے۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا ڈر لگتا ہے۔ آگے کی بات سوچی نہیں جا سکتی۔ من کانپ اٹھتا۔ ہر طرف خلا ہے سب خالی۔ ٹھیک جیسے پیٹ کا اندرونی حصّہ ہو، اسی کا تو ڈر لگا ہوا ہے۔

اندھیرا گھنا ہوتا ہے۔ ہر جانب ایک خلش سی تیرنے لگتی ہے۔ گھر کے اندر کھوکا روتا ہے۔ اٹھ کر دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ جسم نڈھال، من بے بس

آگ جلتی ہے، پیٹ میں، سر میں جلتی ہے، اور بجھتی ہے، بھرا پیٹ، اور خالی پیٹ کتنا فرق ہے۔

دھیرے دھیرے شاہ جی آئے ——— "کون ہے جی! بیسُو کی بہو ہے نا؟"

رانی کے دل میں کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا۔ شاہ جی آئے ہیں۔ اٹھ کر بیٹھے، آسن دے، گھونگھٹ نکال لے، نہیں کوئی بات نہیں، من ہی من میں بے بس ہو کر ٹبر ٹبراتی ہے ——— بھات، بچّہ کیا کھائے گا؟ کیسے بچے گا؟

شاہ جی نے ڈیوڑھی کے پاس کھڑے کھڑے ہی دکھ ظاہر کیا۔

"——— بیسُو سچ مچ بھاگ گیا۔ بچّے کا بھی خیال نہیں کیا۔ ابھاگا، بدمعاش!"

رانی سوچتی ہے ——— بھات، تھالی کے اوپر گول ڈھیر کی شکل میں اونچا پروسا ہوا بھات، جھٹ چنتا کو ہٹاتی ہے۔ ننھی سی آشا کی چنگاری ابھرتی ہے۔

بولی ——— شاہ جی! بڑی بھوک لگی ہے۔ بچّہ بھوک سے کل ہی مر جائیگا کیا ذرا سا چاول نہیں دیں گے۔ آپ کے گھر میں داسی کا کام کروں گی تھوڑا سا چاول دے دو نا شاہ جی!

شاہ جی ——— ہی ہی ہی ہنس کر بولے۔ "چاول کیا اتنا سستا ہے ری۔ ایسا ہوتا تو گاؤں بھر کی عورتوں کو داسی رکھ لیا جاتا۔"

رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ یکایک ڈیوڑھی سے چلکھا کر شاہ جی کے پیر پکڑ لیتی ہے۔ پیٹھ بالکل ننگی تھی۔ دائیں طرف چھاتی کا کپڑا ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ اس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں گیا۔ پیروں پر بار بار سر رگڑ کر کہتی ہے ——— "تھوڑا سا چاول دے دو نا شاہ جی!

عورت کا جسم، گھٹنا ٹیک کر، سر رگڑتے رگڑتے کمان کی طرح لچکی جاتی ہے اندھیرے کے جھٹپٹے میں شاہ جی کا لوبھ اور بھی جاگ اٹھتا ہے۔

"اُری کیا کر رہی ہے ـــــ کیا کر رہی ہے ـــــ یہ کہتے کہتے شاہ جی نے اس کے گال پہ ہاتھ رکھ کر منہ اٹھایا۔ اس کے بعد ذرا ملائم آواز میں بولے ـــــ چھوڑو، چھوڑو، اٹھ کر بیٹھ۔ اس کی بغل کے نیچے ہاتھ دے کر انھوں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

رانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اپنا سر جھکائے ہوئے دھیمی آواز میں شاہ جی بولے ـــــ "چاول تو لے گی پر اس کا دام بھی دے سکے گی؟ داسی پن سے چاول کا دام نہیں چکتا، سمجھی!"

اس کے بعد اس کے کان کے پاس کھسر پھسر کے انداز میں بولے ـــــ چاول چاہیئے تو رات کے دس بجے ہمارے گھر آنا، اُدھر پیچھے کی طرف، ہماری بیٹھک کے پچھلے دروازے پہ دھیرے سے تھپتھپانا بڑی ہوشیاری سے کسی کو پتہ نہ لگے، سمجھی؟ ـــــ اور اس کا گال دبا کر شاہ جی جلدی سے نکل جاتے ہیں دور جا کر پھر ایک بار کہتے ہیں ـــــ سمجھ گئی نا؟

ہاں، رانی سمجھتی ہے۔ سر میں جیسے جگنوؤں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ چمکتے ہیں اور بجھتے ہیں۔ ذرا دیر بعد بچے کو تھپک کر کاٹھ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔

* * * *

رانی شاہ جی کے ہاں سے لوٹی۔ تو گہری رات تھی۔ شاہ نے کہا تھا ـــــ بالکل سویرے ہی چلے جانا۔ گاؤں میں آدمی تو ہیں نہیں۔ کون دیکھے گا؟ ـــــ

گھر میں ہلکی ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بچہ سکڑا ہوا پڑا سو رہا تھا۔ شاید کئی بار چلّایا تھا۔ کتنا ہی رویا تھا۔ گال پہ سے ہو کر آنکھ کا پانی بہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا داغ ابھی تک نہیں سوکھا تھا۔

رانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے رام۔ اگر کہیں گیدڑ گھس آتا۔ بچے کو

سینے سے چمٹا کر سوکھی سی چھاتی منہ میں ٹھونس دیتی ہے۔ دھیرے دھیرے کہتی جاتی ہے ـــــ میرے دھن ـــــ! بیٹا، لال!"

(۳)

چاول جب سونا ہو اور اسی چاول کے بدلے عورت ملے تو ایک سے جی کیونکر بہلے۔

شاہ جی کا شوق بھی تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گیا۔ رانی سے کہہ دیا اب میں چاول نہ دے سکوں گا۔

پھر بھی رانی رات کو جاتی ہے۔ دروازہ تھپتھپاتی ہے اور آخر میں دھکّا دے دیتی ہے۔ شاہ جی کوئی جواب نہیں دیتے۔

اور چاول ہی کتنا ملتا! اس کا اور اس کے بچے کا پیٹ ایک وقت بھی بھر نہ پاتا۔ پھر بھی یہی سورگ تھا۔ اس کے لئے سب کچھ کھو سکتی ہے۔ رانی شاہ جی کی تلاش میں رہتی ہے۔ ایک دن رستے ہی میں پکڑ لیا ـــــ "دہائی ہے شاہ جی! تھوڑا چاول دے دو۔ ایک دم مت دھتکارو۔"

بہت دنوں تک آدھے پیٹ بھوجن سے جسم کی خوبصورتی جاتی رہی تھی۔ شاہ جی نفرت سے من ہی من میں سوچتے ہیں۔ یہ کوڑا کرکٹ مجھے کیسے اچھا لگا تھا۔

چیخ کر سارے گاؤں کو سر پر اٹھاتے ہوئے بولے۔ "دور ہو بھوتنی! کہیں کی، تیرے جیسی کمینی کے لئے لوگ چاول لے کر بیٹھے ہیں! نکل ڈائن! نکل جا! نہیں تو پولیس سے پکڑوا دوں گا۔"

..... اس کے بعد؟ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کہیں ایک رات کے بدلے ایک مٹھی چاول ملا اور پھر سات دن کچھ نہیں۔

اب وہ مریل سی گائے معلوم ہوتی ہے۔ دماغ میں اور کوئی خیال آتا ہی نہیں صرف بھات..... مانڈ..... کھانے کو کیا ہے؟

اب گھر نہیں۔ راستے راستے۔ دن میں، رات میں پاگل کتّے کی طرح ہر طرف کا چکّر لگا آتی ہے۔ کہیں کوئی دودا نے چاول ڈال دیتا ہے۔ کہیں کوئی تھوڑی سی مانڈ مٹھائی کی دکان کے سامنے لیٹے لیٹے مچ مچاتی آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مانگنے کی بھی ہمّت نہیں ہوتی۔

بچّہ ہانپتا ہے باپ رے! ذرا سے بچے کے جسم میں اتنی ہڈیاں ہوں گی۔ یہ کون جانتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ کئی دن کا مرا ہوا ہے۔ اور کسی نے قبر سے نکال کر رکھ دیا ہے۔ پر وہ کھانا کھاتا ہے۔ اب کھڑا نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے، ہاتھ کے پاس جو کچھ پاتا ہے۔ منہ میں ڈال لیتا ہے۔

ایسے بھوک کے مارے بچّے کو لادے لادے گھومتی ہے۔ سوچتی ہے ..... کیسی بے شرم جان ہے مرتی بھی نہیں!..... اس دن سویرے سویرے موکشدا بوا کے دروازے پر وہ دھرنا مار کر بیٹھ گئی "بوا! تھوڑی مانڈ دو۔ ترکاری کے چھلکے دے دو۔ کچھ تو دو۔ کئی دن سے پیٹ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔"

"——— کچھ نہیں ہے ری! کچھ نہیں، مانڈ تو پچھلے بھات کھانے والے دن بنی تھی۔ وہ تو کب کی ختم ہو گئی۔"

کسی طرح بھی ٹالے نہ ٹلی۔ تو ایک مٹھی چنے لا کر بچے کے ہاتھ میں دیدیئے، میّا رے میّا کیسا بچّہ ہے سب کے سب چنے ایک ہی بار منہ میں ٹھونس لئے۔

رانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک دانہ بھی نہیں دیا۔ بڑا غصّہ آیا۔ جھٹ سے لڑکے کو زمین پر پٹک دیا۔ منہ میں انگلی ڈال کر وہ ایک چنا نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

جوان سپاہی۔ پھولے پھولے چہروں سے تیل ٹپکتا ہے۔ رانی دور کھڑی تاکتی ہے۔ ان کے چہرے دیکھ کر من میں خیال آتا ہے ـــــ دال اور روٹی۔ پھولی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں، بہت سی روٹیاں، پھولی پھولی روٹی اور دال، جتنی طبیعت ہو، کھاؤ۔

وہ دھکا دے کر لوگوں کو ہٹا دیتے ہیں۔ عورتوں کو ذرا آہستہ سے کہتے ہیں ـــــ ہٹ جا عورت، بیچ بیچ میں آنکھ بھی مارتے جاتے ہیں۔

..... مایوس ہو کر گھومتے گھومتے پھر چکر، اب کے پیر آگے نہیں چلنا چاہتے۔ اور چلتے رہنے سے حاصل؟ چل کر جائے بھی کہاں؟

کچھ دور جا کر ایک جلے ہوئے گھر کے برآمدے میں لڑکے کو بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ اوہ، پیٹ میں کیسی آگ ہے، سر تک پھنک رہا ہے، ایک بار پھر لیٹ گئی۔ پر اس سے جوالا جیسے اور بھی بھڑک اٹھی۔ پھر اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ من میں اور کچھ نہیں آتا۔ بس سوچتی ہے۔ بھات..... روٹی..... دال..... چنے۔

بچے نے برآمدے میں لیٹے لیٹے ہی ہگ دیا۔ پانی کی طرح پتلا دست۔ بڑی دور تک پھیل جاتا ہے۔ اس میں چنے ہیں ـــــ سالم کے سالم، جیسے کھائے تھے، بالکل ویسے ہی، دو ایک آدھے ہو گئے ہیں۔ باقی چھلکے سمیت جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔

سالم چنے..... کھانے کی چیز..... کہنی کے سہارے اٹھ کر رانی کتنی دیر تک بیٹھی انھیں تاکتی رہی۔ سامنے تالاب میں سے آنچل بھگو کر پانی لیکر دھیرے دھیرے دھو کر چنے الگ کئے۔ دھیرے دھیرے انھیں پھر دھویا۔ بڑی کوشش سے، جیسے بہت قیمتی چیز ہو۔

اس کے بعد ایک ایک چن کر کھانے لگی۔ ایک ایک کر کے بھی نہیں کتنی دیر تک

اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ گھما پھرا کر چباتی ہے۔ جب تک ایک ایک ایک دانہ بالکل ختم نہیں ہو جاتا۔ تب تک دوسرا نہیں اٹھاتی۔

کھا کر چت لیٹی رہی۔ پیٹ کے اندر آگ تو کم نہیں ہوئی۔ بچے نے پھر مگ دیا اس بار چنے نہیں تھے۔ صرف پانی اور کچھ چھلکے۔ چت لیٹے لیٹے رانی دیکھتی ہے، پر ہلتی نہیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد پچکاری مار کر پانی ہی پانی ——— اب کے بھی رانی اٹھ کر نہ بیٹھی۔ بچے کو دھلایا بھی نہیں۔ بچے کی ہڈیوں کے اوپر صرف چمڑی ہے شام کا اندھیرا جھکتا ہے۔ ٹھنڈک بڑھتی ہے۔ دماغ میں ایک ہی خیال گھومتا ہے ——— روٹی ..... دال ..... چنا۔

راہ چلتے سپاہی نے رک کر پکارا، "او عورت! روٹی ملے گی؟" یہاں رہتے رہتے سپاہی نے بنگلا سیکھ لی تھی۔

رانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ——— "کہاں جی؟ کدھر؟ دو ——— دو!"

"——— ارے یہاں نہیں، ہمارے ساتھ آؤ، روٹی ملے گی۔"

اس دوران میں بچے نے شاید ایک بار پھر دست کیا۔ اسے بنا دھوئے ہی گود میں لٹکائے رانی سپاہی کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

اگھن کی شام تھی۔ خوب جاڑا پڑ رہا تھا۔ سپاہی کے بدن پر گرم اوور کوٹ تھا سپاہی اسے جھاڑی میں گھسیٹ لے گیا۔ اس کے بعد دونوں ہاتھوں سے اُسے چمٹا لیا، بولا ——— "روٹی دے گا، پیسہ دے گا ——— لیکن بعد میں۔"

رانی نے بچے کو زمین پر لٹا دیا۔ اس کے بعد سپاہی رانی کے ساتھ لیٹ گیا پیٹھ میں ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ جھاڑی کے اوپر آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

گرم کوٹ کھول کر الگ پھینکتے ہوئے رانی کو چمٹاتے چمٹاتے سپاہی کو

گھن سی آئی۔ بولا۔ "دور ہو ڈائن! تیرے لڑکے کا منہ دیکھ کر تو سب خوشی کافور ہو جاتی ہے۔" گھبرا کر رانی نے چت لیٹے لیٹے ہی ٹٹول کر صرف اندازے ہی سے سپاہی کا کوٹ لڑکے کے منہ پر ڈال دیا۔ وہ کتنا بھاری ہے۔ اٹھایا ہی نہیں جاتا۔

من میں ایک ہی خیال گھومتا ہے ـــــ بھات..... روٹی..... بھات..... پیسہ، بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔ سپاہی کی چھاتی کے نیچے دم اٹکا جا رہا ہے، دانت سے دانت لگے جا رہے ہیں..... سپاہی کھڑا ہو کر جب پھر کوٹ پہنتا ہے۔ تو رانی سے گویا اٹھا ہی نہیں جاتا۔ سر چکر کھاتا ہے چھاتی دب گئی ہے۔

کوٹ لے کر کھوکا کے جسم کو ہاتھ لگاتی ہے۔ بالکل ٹھنڈا، برف، گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک دو بار ہلایا۔ کوئی جواب نہیں۔ آنکھیں الٹ گئی تھیں بیتابی سے اٹھ کر بچے کا جسم گود میں دبا لیتی ہے۔

سامنے کی طرف نظر جاتی ہے۔ ارے! کوٹ پہنے سپاہی تو چلا جا رہا ہے۔ روٹی تو دی نہیں! پیسہ بھی نہیں! بچے کا جسم زمین پر پھینک کر رانی چلی ـــــ سپاہی کے پیچھے پیچھے۔

جوشؔ ملیح آبادی

کال گیت

عزیزی بنے طلوعِ آفتاب سے پیشتر سے یہاں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی برس رہا ہے۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمام تر سیّال ہو کر آنکھوں سے بہہ جائیگا ہندوستان میں کیسا رومجھوم کے پانی برسا کرتا ہے۔ جل تھل ایک ہو جاتے ہیں اور ہماری زمین کتنی زرخیز ہے، دو چھینٹوں کے بعد سونا اگلنے لگتی ہے۔ پھر بھی ہم ننگے ہیں بھوکے ہیں۔

دور کیوں جاؤ اپنے بنگال ہی کو دیکھو۔ کتنا سرسبز و شاداب صوبہ ہے۔ مگر بھوک وہاں اپنا پرچم کھولے ہوئے ہے انھیں خیالات سے متاثر ہو کر میں نے اس وقت یہ گیت کہا ہے گیت کی مجھے قطعی مشق نہیں ہے۔ اور چونکہ میری زبان بہت زیادہ فارسی آمیز ہے۔ اس لئے گیت کہنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ بہرحال یہ میرے دل کی ایک غمگیں لہر ہے —— جو پونے سے اٹھ کر بمبئی تک آگئی ہے۔

جوشؔ

گیت

برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما، جھما، جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی

—— ۱ ——

پھر بھی ہے مری زمین پیاسی ہر باغ پہ چھائی ہے اُداسی
ہر گل کا ہے رنگ ارغوانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما، جھما، جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

—— ۲ ——

آکاش پہ گا رہے ہیں بادل پُروائی کی بج رہی ہے چھاگل
مہنگائی وہی، وہی گرانی،
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما، جھما، جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

—— ۳ ——

بھوکے مرمر کے سڑ رہے ہیں وہ کال پہ کال پڑ رہے ہیں
جھونکوں میں ہے موت کی کہانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما، جھما، جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

—— ۴ ——

سنسان ہیں تن نگر کی کلیاں مرجھائی پڑی ہیں من کی کلیاں

دم توڑ رہی ہے زندگانی،
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھا، جھما جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

۵

ہر رُخ پہ نخوستِ غُلامی ہر لب پہ غُبارِ تشنہ کامی
ہر آنکھ پہ مُہرِ ناتوانی،
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھا، جھما جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

۶

ہر ابر کی چھاؤں میں جلا پا ہر سائے میں رینگتا بڑھاپا
ہر موڑ پہ اونگھتی جوانی،
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھا، جھما جھم برسوں سے برس رہا ہے پانی

سبطِ حسن

زندگی کی نقش گری

اقبالؔ کو ہندوستان کے آرٹسٹوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ زندگی کی کشاکش سے ناآشنا ہیں۔ اور "شئے کی حقیقت" تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا آرٹ بناوٹی اور بے جان ہوتا ہے۔ اُس میں زندگی کی ہیئت اور ماہیت کو بدلنے کی، اس کو مادی اور روحانی بستیوں سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر لے چلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے آرٹ میں جا بجا موت کی نقش گری پائی جاتی ہے۔ وہ اس سے لذت لیتے ہیں اور دوسروں کو اس سے لذت لینے کی دعوت دیتے ہیں۔ بہت ترقی کی تو کھوئے ہوؤں کی جستجو میں لگ گئے۔

ہندوستان کے موجودہ آرٹ پر نظر رکھنے والوں سے یہ چیز چھپی ہوئی نہیں ہے کہ گنتی کے دو چار آرٹسٹوں کو چھوڑ کر ہمارے اکثر آرٹسٹ اب تک سچ مچ کھوئے ہوؤں کی جستجو کی منزل سے آگے نہیں بڑھے ہیں، انھیں نہ "حال" کی خبر ہے، نہ مستقبل کی فکر، ماضی کے چند روایتی موضوعات ہیں، چند متعینہ راہیں ہیں، آبا و اجداد کی کھینچی ہوئی چند دھندلی لکیریں ہیں۔ جن میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نہ اپج ہے، نہ اجتہاد ہے۔ نہ تخلیق کی قوت ہے نہ حقائق کو سمجھنے کا شعور ہے۔ پھر آرٹ ترقی کرے تو کیسے، تصویروں میں جان پڑے تو کیونکر؟

لیکن پچھلے اگست میں چٹگاؤں سے پنسل کی ہوئی چند تصویروں کا ایک

پارسل آیا۔ ان تصویروں نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ یہ تصویریں وہاں کے ایک آرٹسٹ کامریڈ چتّا پرشاد نے بنائی تھیں اور ان کا موضوع تھا "بھوک" ان کو دیکھ کر زندگی کی نقش گری اور موت کی نقش گری کا فرق سمجھ میں آیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انقلابی حقیقت نگاری اور فوٹو گرافی ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں بعض تصویریں زندگی کا صحیح چربہ ہوتی ہیں پھر بھی ان پر موت کی مردنی چھائی ہوتی ہے۔ لیکن چتّا کی یہ تصویریں جن میں موت کے خطوط کے خم و پیچ کا پابند کیا گیا تھا۔ زندگی کا ایک ایسا عبرتناک منظر پیش کر رہی تھیں، ہماری سماجی پستی اور زبوں حالی کا ایک ایسا نقشہ کھینچ رہی تھیں کہ بے حس سے بے حس انسان بھی ایک بار چونک اٹھے اور بے عمل سے بے عمل شخص بھی ان حالات کو بدلنے پر مجبور ہو جائے۔

جس وقت یہ تصویریں بنائی گئیں۔ چٹ گاؤں کا کیا حال تھا؟ ذخیرہ اندوزوں اور نفع خوروں کی ہوس کی بے شرمی نے عام شہریوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا مٹھی بھر خوش حال لوگوں کے سوا کسی کو دو وقت کی روٹی میسر نہ تھی۔ اناج چور بازاروں میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں قیمتیں اتنی زیادہ تھیں کہ عوام کے لئے اناج کا خریدنا ناممکن تھا۔ بچوں اور عورتوں کی بری حالت ہے۔ پچھلے سال کسان عورتیں بھیک مانگتی پھرتی تھیں۔ اس سال بھیک مانگ کر بھی پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ اب وہ جسم فروشی پر مجبور ہو گئی ہیں۔ بھوکی مائیں اپنے بچوں کو جن کی ہڈیاں نکل آئی ہیں سڑکوں اور گلیوں میں چھوڑ دیتی ہیں۔ اب تک سینکڑوں آدمی بھوک سے مر چکے ہیں..... بھوک اور فاقہ کشی کا اثر تعلیم پر بھی پڑ رہا ہے۔ اسکول بند ہو رہے ہیں۔ بھوکے بچے اسکول نہیں جا سکتے۔ ان کے والدین کتابیں اور کاپیاں نہیں خرید سکتے۔" (قومی جنگ" ۲۲ اگست ۱۹۴۳ء) غرض زندگی کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اخلاق اور تہذیب کی وہ قدریں جو ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہیں ایک ایک کر کے

فنا ہو رہی تھیں۔ اس قومی تباہی پر جاپانی درندوں کی بم باری مستزاد تھی۔ موت کے یہ پیامبر چیٹ گاؤں کے محشرستان میں ہر ہفتے دس بیس بم پھینک جاتے تھے۔ اگست ۱۹۴۳ء تک چیٹ گاؤں پر ۴۵ مرتبہ بم باری ہو چکی تھی۔

چتّا پرشاد نے ان تصویروں میں چیٹ گاؤں کی اسی بربادی اور موت کا نقشہ کھینچا تھا۔ اور بھوکوں کی پکار اور بے زبان تصویروں کی زبانی سنائی تھی۔ بموں کی زہریلی بارش نے مکانوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا ہے، لاشیں کنکر اور پتھر کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ جو بچ رہے ہیں وہ کس مپرسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ نہ جانے انھیں گھر کی بربادی اور گھر والوں کی موت کا غم ہے۔ یا اپنی بے بسی اور مستقبل کی تاریکی کی کا خوف، ایک لنگر خانے میں بھوکے بچوں کا ہجوم ہے ننگ دھڑنگ بچے جن کے پیٹ مسلسل فاقہ کشی سے پھول گئے ہیں، ادھر ادھر رینگ رہے ہیں ـــــ لیکن لنگر خانے میں اتنا کھانا بھی نہیں ہے کہ خالی بچوں کا پیٹ بھرا جا سکے۔ عورتوں اور مردوں کا تو ذکر ہی کیا ـــــ غرض چیٹ گاؤں کی حقیقتیں اپنے تمام عواقب و نتائج کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ لیکن ایک تصویر ایسی تھی جس میں چیٹ گاؤں نہیں بلکہ پورے بنگال کی روح کھنچ آئی تھی۔ یہ صرف ایک عورت اور اس کے بچے کی تصویر نہ تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی سماج اپنے مستقبل کو گود میں لئے انسانیت کی عدالت میں کھڑی فریاد کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے دیکھو فاقہ کشی نے میرا یہ حال کر دیا ہے کیا تمہیں میری پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں میں میری مایوسی، میری لاچاری اور میری آنے والی بھیانک زندگی کی دہشت نہیں نظر آتی، کیا آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے میرے دکھ درد کی کہانی نہیں سناتے، کیا میرے بالوں کی پریشانی میرے لٹے ہوئے سہاگ کا پتہ نہیں دیتی، کیا میرے نڈھال بچے کے مٹے ہوئے خدوخال، اس کے بے جان جسم کا

جھکاؤ، اُس کے ہاتھ پاؤں کی فتادگی تمہاری نیند نہیں اچاٹ کر دیتی۔ تمہیں آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتی۔ اٹھو! میری زندگی سے سبق لو، ورنہ موت پورے ملک کو جلد اپنے شکنجے میں کس لے گی۔

نومبر میں چتا پرشاد نے اپنی تصویروں کا دوسرا مجموعہ بھیجا۔ گو ان تصویروں کا موضوع بھی پچھلی تصویروں کی طرح "بھوک" ہی ہے۔ لیکن اس کے جو مختلف اثرات دکھائے گئے ہیں، اُن میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ بعض موضوع اتنے مشکل ہوتے ہیں، اتنے دردناک ہوتے ہیں کہ معمولی آرٹسٹ ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ جذبات کے حاوی ہو جانے سے اس میں شدید داخلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی فنی صلاحیتیں جواب دینے لگتی ہیں، اُس کے آرٹ کا بازو شل ہو جاتا ہے۔ لیکن چتا پرشاد ان کمزور دل والوں میں نہیں ہے، وہ ان تلخیوں کی اصل حقیقت جانتا ہے، وہ کمیونسٹ ہے۔ لہٰذا اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی تلخیوں کے باوجود اس کے ہوش و حواس درست رہتے ہیں، ان بھیانک پرچھائیوں کو دیکھ کر اس کے بازو شل نہیں ہوتے، بلکہ وہ نئے جوش اور ولولے، نئی انقلابی امنگ، نئی قوت ارادی کے ساتھ اٹھتا ہے۔ اور ان پر قابو پا لیتا ہے۔ سچا آرٹ حقیقتوں کے آگے سپر نہیں ڈالتا، بلکہ ان کو نئی روشنی میں پیش کرتا ہے، ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ چتا پرشاد نے اپنی نئی تصویروں میں یہی کیا ہے! ان تصویروں میں بنگال کی فاقہ کشی اور قومی بربادی کے مختلف رُخ دکھائے گئے ہیں۔ بوڑھے کسانوں پر کیا گزرتی ہے، جوان عورتوں پر کیا گزرتی ہے، خانماں بربادوں پر کیا گزرتی ہے۔ اور اس طرح بنگال کی —— داستانِ غم مکمل کی گئی ہے ——

نذیر احمد ایک بوڑھا کسان ہے، جس نے کبھی بھیک نہیں مانگی ہے۔ بلکہ سدا محنت کر کے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالا ہے، ذخیرہ اندوزوں نے اس کی کھڑی

فصل خرید لی۔ گھر کا اثاثہ بک گیا۔ بھوک سے مجبور ہو کر گھر والے سڑکوں پر مارے مارے پھرنے لگے۔ لیکن نذیرا حمد مر جائے گا بھیک نہیں مانگے گا، بھوک کی مار گھر بار کے تباہ ہونے کا غم، بیوی بچوں کے چھٹ جانے کا صدمہ، اُس کے ہوش و حواس جواب دیتے ہیں، وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ نام پوچھو تو تین چار منٹ کے بعد آہستہ سے جواب دیتا ہے "نذیر احمد" شاید اسے اپنا نام بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ پوری کہانی چتّا پرشاد نے نذیر احمد کی معنی خیز نشست، اس کے تھکے ہوئے سر، اس کے قلندرانہ استغنا اور غیرتِ نفس کا چہرہ کھینچ کر بیان کی ہے۔

دوسری تصویر ان خانماں برباد وں کی ہے جو گاؤں سے لاکھوں کی تعداد میں کلکتہ اور دوسرے شہروں میں قسمت آزمائی کرنے آتے ہیں اور سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں جب چلنے کی سکت نہیں رہ جاتی تو سڑک کے کنارے کسی بجلی کے کھمبے کے پاس تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تصویر فنی اعتبار سے چتّا کی بہترین تصویروں میں سے ہے۔ اس میں حقیقت نگاری اور اشاریت کا بہت کامیاب امتزاج پایا جاتا ہے۔ بجلی کے لیمپ سے علم و نور کی شعاعیں نکلنی چاہئیں۔ لیکن بنگال میں آج تہذیب کا ستون گر رہا ہے۔ وہ روشنی کے پروانوں اور تہذیب کے شیدائیوں کی رہنمائی کرنے کے بجائے انھیں سپردگی اور فتادگی کی تلقین کرتا ہے بھوک آدمی کے حواس معطل کر دیتی ہے، اس کا دماغ چکر کھانے لگتا ہے۔ اس کے اردگرد کی ہر چیز ناچنے لگتی ہے، اس کھمبے کا بھی یہی حال ہے۔ بھوکوں کی نظر میں یہ بے جان کھمبا بھی ناچ رہا ہے ـــــ موت کا ناچ ـــــ لیکن انقلابی آرٹسٹ شکست نہیں مانے گا۔ شکست تو آرٹ کی موت ہے، لہٰذا اس نے پس منظر میں بیزاری کا عنصر بھی داخل کر دیا ہے ـــــ ایک عورت اور اس کے بچّے کی بیزاری ـــــ حال اور مستقبل کی بیزاری ـــــ جس میں سرکشی اور نافرمانی بھی شامل ہے

یہ عورت تہذیب کے گرتے ہوئے ستون کی طرف سے شکست کھائے ہوئے ناداروں کی طرف سے پیٹھ موڑے کھڑی ہے اور اس کی خود اعتمادی تو دیکھیئے وہ ہار نہیں مانے گی، وہ اس ہزیمت یافتہ فضا سے نکل کر آگے بڑھے گی۔

زندگی سے ہار مان لینے کے بعد اس لٹے ہوئے قافلے کا رہا سہا شیرازہ بھی بکھرنے لگتا ہے۔ بوڑھے دم توڑ رہے ہیں، بچے بلک بلک کر اپنی ماؤں کو یاد کرتے ہیں۔ جو انھیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ اور پھر ادھر ادھر رینگنے لگتے ہیں، ان کا ایک گروہ کوڑے کے ڈبے کو گھیر بیٹھا ہے۔ سڑے ہوئے چاول کے دو دانے، سوکھی روٹی کے ایک آدھ ٹکڑے، پھلوں کے چھلکے، غرض جو چیز زبان کا ذائقہ بدل دے اور بھوک کی چنگاریوں کو ایک لمحے کے لئے دبا دے۔ پیٹ کی نذر ہو جاتی ہے جوان عورتوں کے پاس جب کوئی اثاثہ نہیں رہ جاتا اور پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا تو وہ اپنا سب سے قیمتی زیور بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور عصمت کے انمول موتی سر بازار لٹنے لگتے ہیں۔ ایسی ہی ایک بدنصیب عورت چتا پرشاد کی تیسری تصویر کا موضوع ہے۔ چتا پرشاد اس سے ملے ہیں اور مچھیرے کی اس چودہ سالہ لڑکی نے جو ایک ہفتے تک مردوں کی نفس پرستی کا شکار رہ چکی ہے اور اب مختلف جنسی امراض میں مبتلا ہے۔ چتا پرشاد سے اپنی داستان غم رو رو کر بیان کی ہے۔ اور آرٹسٹ نے اس "نخل ماتم" کو کاغذی پیرہن پہنا کر ہندوستانی سماج کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہندوستان کا ہر نوجوان اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔ چتا پرشاد نے اس "شرمندۂ شباب" کی روح کی افسردگی کو اس کے مریمی انداز، اس کے چہرے کی اداسی اور چادر کے لپیٹ کے ذریعے دکھایا ہے۔ اس کے ہاتھوں کا بے ڈھنگا پن اس کی جنسی بیماری کو ظاہر کر رہا ہے

چتا پرشاد نے اپنی تصویروں کی تیسری قسط دسمبر کے پہلے ہفتے میں

بھیجی ہے۔ وہ کیفیت کے اعتبار سے اس کی بعض پچھلی تصویروں پر بھی سبقت لے گئی ہے۔ ان تصویروں میں اس نے مدناپور کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اس بھرپور طریقے پر، اس اعتماد کے ساتھ کہ دیکھنے والا ایک نظر میں اُن مادی اور اخلاقی صعوبتوں کو محسوس کر لیتا ہے جن سے اس ضلع کے لوگ دوچار ہو رہے ہیں، چغتا کا آرٹ بڑی ترقی کر رہا ہے، اس کا تجربہ بڑھ رہا ہے، اس کی نظر زیادہ گہری پڑنے لگی ہے۔ وہ اپنے موضوع اور پس منظر کی ہم آہنگی اور ان کے باہمی تضاد کو نمایاں کرنے پر اب زیادہ قادر ہے اور پوری پوری داستان اشاروں اور کنایوں میں کہنے لگا ہے، اسے اپنے قلم کی جنبش اور اس کی قوت پر زیادہ بھروسہ ہو گیا ہے۔ اس کے خطوط کی بے ساختگی اس کے احساس کی شدت کا پتہ دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط کلائی کی جنبش کے مرہون منت نہیں ہیں۔ بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ہیں۔ مانا کہ ان خطوط میں اجنٹا کے خطوط کی سی یکسانیت نہیں۔ بلکہ کھردراپن ہے۔ لیکن لکیروں کا یہ توڑ مروڑ، یہ اتار چڑھاؤ۔ موٹے اور پتلے خطوط کا یہ الجھاؤ موجودہ دور کی سماجی بے اطمینانی اور ذہنی الجھاؤ کا آئینہ ہے — ان دنوں بنگال میں جو انتشار پایا جاتا ہے اور وہاں کی زندگی کا شیرازہ جس طرح ٹوٹ رہا ہے۔ اس کو صرف انھیں ٹوٹی پھوٹی لکیروں ہی سے ظاہر کیا جا سکتا تھا۔

مدناپور، بنگال کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ ضلعوں میں سے ہے پہلے سیلاب نے غریبوں کے جھونپڑوں اور کھیتوں کو غرقاب کیا، جو بچ رہا تھا۔ اُسے طوفانی ہوائیں بہا لے گئیں۔ اور جو ان دونوں آفتوں سے بچا وہ ذخیرہ اندوزوں کی نذر ہو گیا۔ انسانیت کے ان دشمنوں نے گاؤں کی معاشی زندگی کو جس طرح تتر بتر کیا ہے، کسانوں کی گاڑھی کمائی جس طرح ہضم کی ہے۔ اس کا ایک

ہلکا سا چربہ ان دونوں خاکوں میں ملتا ہے۔ پہلا خاکہ ایک خوش حال کسان کا ہے جس نے بھوک سے تنگ آکر اپنا آخری اثاثہ یعنی ایک بیگھہ کھیت بیس سیر دھان کے بدلے بیچ دیا ہے۔ مدناپور کے سب رجسٹراروں کے دفتر میں ان دنوں یہی اندھیر مچا ہوا ہے۔ ہزاروں کا مال کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔ کسان جانتا ہے کہ وہ لٹ رہا ہے۔ لیکن وہ بے بس ہے۔ اس کے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ چتا لئے کسان اس کی بیوی اور اس کے بچے کا جو خاکہ کھینچا ہے۔ اس میں تینوں کے چہروں پر تین مختلف کیفیتیں دکھائی ہیں۔ کسان کی نظریں دور کسی چیز پر جمی ہوئی ہیں۔ شاید وہ اپنے کھیت کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ پس منظر میں ایک درخت کی دو سوکھی شاخوں سے منظر کی المناکی بڑھائی گئی ہے۔ اور سامنے ایک درانتی اور ناریل دھرا ہے۔ کسان کی "خوش حالی" کا مزار ——

دوسرا خاکہ کونتئی کے دو کنگالوں کا ہے۔ میر تقی میر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ؎

دل کی آبادی کی اس حدِّ خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

چتا کی یہ تصویر دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ اس راہ سے نازیوں کا لشکر گزرا ہوگا۔ یا جاپان نے بمباری کی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ بدنصیب کنگال خود اپنے بھائی بندوں کی ہوس کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کنگالوں کو جن کے پاس اس جھونپڑے اور مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکوؤں نے آکر خوب پیٹا۔ جھونپڑی کی تلاشی لی اور جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو جھونپڑی گرا دی۔ برتن توڑ ڈالے اور ان کے جسم کا لتا تک اتار لے گئے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، بلکہ آئے دن کے واقعات ہیں۔ جو بنگال کے دیہاتوں میں پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ تصویر صرف چتا پرشاد کے قلم کا اعجاز نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اخلاقی پستی کا مرثیہ ہے۔ ہماری بے حسی اور بے غیرتی کے

خلاف احتجاج ہے۔ یہ تصویر خانہ جنگی کا عبرت خیز منظر دکھاتی ہے۔ آپس کی پھوٹ نے بنگال کی جو حالت کر دی ہے اُس سے متنبہ کرتی ہے۔ یہی پھوٹ وہاں کی سیاسی زندگی میں بھی جھلکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہاں کی مختلف سیاسی پارٹیاں اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیتیں اور متحد ہو کر اپنے صوبہ کو اس بڑھتی ہوئی تباہی اور خانہ جنگی سے بچاتیں۔ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہی ہیں! ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے اس مہلک مشغلے سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔ نہ بنگال کے ہندو عوام کا پیٹ بھرتا۔ نہ مسلم کسانوں کے گھر میں اناج آتا۔ بلکہ صرف ذخیرہ اندوزوں کی بن آتی ہے اور نوکر شاہی کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔

چتا پرشاد نے ان تصویروں میں حیات بنگال کی نقش گری کی ہے جو موت سے ہم آغوش ہو رہی ہے! اور اگر ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں نے خواہ وہ کانگریسی ہوں یا مسلم لیگی اس خطرے کو محسوس نہ کیا اور متحد ہو کر اس کا مقابلہ نہ کیا تو موت حیات پر غالب آئے گی اور کون کہہ سکتا ہے کہ برطانوی سامراج ہماری اس پھوٹ سے خوش نہیں ہے جو ہندوستان کو آزادی سے، ترقی سے، اپنے وطن کی حفاظت سے محروم کئے ہوئے ہے۔

جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں چتا کے آرٹ نے چند ماہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ چتا کا آرٹ اول درجے میں شمار ہونے لگا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آرٹسٹ کی فنی ترقی کے لئے اس کا زندگی کے بہتے ہوئے دھاروں سے ہم کنار ہونا ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں اس کے قلم کے خطوط میں زندگی کی جھلک اور زندگی کا زور پیدا ہو سکتا ہے! ابھی چتا کے آرٹ کو وہ درجہ نصیب نہیں ہوا ہے جہاں وہ زندگی پر اثر انداز ہو سکے! آرٹ کا اعلیٰ مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ صرف زندگی کی نقش گری کرے بلکہ وہ اپنی نقش گری سے زندگی کو بدلتا ہے۔

———+———

جگر مرادآبادی

بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں امنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ ارباب نظر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیّاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیّاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو
اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

دیوندر ناتھ ستیارتھی

قبروں کے بیچوں بیچ

دس لاکھ بھوک موتیں، پندرہ لاکھ، اُنیس لاکھ اور اب اس ہفتے تک کُل جمع چوبیس لاکھ! اور ابھی تو اس بھیانک کال کا زور بڑھ رہا تھا..... گیتا کے ذہن میں اُس وقت ایک لوری کے سُر گھوم رہے تھے ــــ "چھیلے گھمالو، پاڑا جڑالو، برگی ایلو دیشے، بُلبلیے دھان کھیئے چھے کھاجا دیبو کیشے؟" یعنی بچّہ سو گیا۔ محلے میں سنّاٹا چھا گیا۔ دیش میں برگی آ گئے۔ بُلبلوں نے دھان کھا لیا اب مالیہ کیسے دیں گے؟

چلتے چلتے اُس نے یہ لوری اپنے ساتھیوں کو سُنائی۔ جعفر نے سب کی طرف سے پوچھا۔ "یہ برگی کیا بلا ہوتی ہے۔ گیتا؟"

"بھیانک برگی..... ناپگی کے راجہ گھورجی راؤ بھونسلے کے سپاہی برگی کہلاتے تھے"

علی امجد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس نغمے میں کسی اہم واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔"

گیتا پہلے چپ رہی۔ پھر جب سب ساتھیوں کی کُھسر پُھسر بند ہو گئی وہ بولی۔ "بنگال کی یہ لوری مجھے سدا اداس کر جاتی ہے۔ نواب علی وردی خاں کا سماں تھا۔ برگی مرہٹے بنگال میں گھس آئے تھے۔ یہ وہ خونی بچھو تھے جن کے

پنجوں سے سانس کھینچ کر لیتی ہوئی جنتا بھی نہ بچ سکتی تھی۔ نواب اُن سے بچنے کے لئے سدا انھیں اپنے خزانے سے کچھ دے دلا کر واپس بھیج دیتا اور اپنا گھاٹا پورا کرنے کے لئے وہ مالیہ بڑھا دیتا۔ جنتا حیران تھی کہ اتنا مالیہ کہاں سے دے۔ بُلبلیں الگ دھان کی بالیاں نوچتی رہتیں۔"

جعفری کہہ اٹھا "میرا تو خیال ہے کہ یہ قحط بھی کوئی دیو قدیمہ گی ہے۔"

"بھیانک برگی! گیتا بولی..... اور برگیوں سے کہیں زیادہ بھیانک تھا یہ کال! آج جل پان کئے بغیر ہی وہ اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑے تھے۔ آج وہ اداس بنگال کی اداس سڑک پر، اداس چلے جا رہے تھے۔

"آگے پیٹے کچھ ڈال، آگے پیٹے کچھ ڈال" گیتا چلّانے لگی۔ یعنی پہلے پیٹ میں کچھ ڈال لے۔ اگر وہ جل پان کر سکی ہوتی تو شاید اُسے ایک فقیر کی یہ صدا یاد نہ آتی۔ اور پھر کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے بھوک کے ماروں کی چیخ پکار اس کے کانوں میں زندہ ہو اٹھی..... سرب نیشے کھدھا..... آمار پوڑا کو پال..... ابھاگا کون دکے جائے؟..... پوچے مر..... پوکا پوڑے مر..... یعنی سرب ناش کرنے والی بھوک! ہمارا جلا ہوا بھاگیہ!! ابھاگا آدمی کس طرف جائے؟ سڑکو مر کیڑے پڑ پڑ کر مر!..... سرب ناش کرنے والی بھوک نے ماؤں کی ممتا تک کو ختم کر ڈالا تھا اور وہ آج اپنی کوکھ کے بیٹوں تک کو گالیاں دے رہی تھیں ——— سڑ کر مر! کیڑے پڑ پڑ کر مر!

ساتوں ساتھیوں کا یہ قافلہ اونٹوں کے بھٹکے ہوئے کاروان کی طرح اُداس اُداس چلا جا رہا تھا۔ سب سے آگے گیتا تھی۔ کھادی کی سپید ساڑھی سُرخ بلاؤز میں ملبوس، اپنے کندھے پر اپنا سامان لٹکائے، اور ایک ہاتھ میں پرٹی کا جھنڈا اٹھائے جس کی سُرخ زمین پر سپید ہنسے اور ہتھوڑے کی شکل بھی مٹیالی اور

اداس اداس نظر آتی تھی۔ اُس کے پیچھے جعفری اور پھر امجد، علی اختر، اور بھوشن، اور ان کے پیچھے پراشر اور کپور۔ سب کے بدن پر قمیص اور نیکر، اپنے اپنے حصے کا سامان اٹھائے ہوئے۔ سب برابر کے کامریڈ۔ ہر طرح کے جذباتی تکلّف سے بے نیاز۔

اُن کے پاس روٹیاں تو تھیں ہی نہیں کہ وہ رُک جاتے اور لوگ کہانی کے راہی کی طرح انھیں کسی پیڑ کی گھنی چھاؤں میں کپڑا بچھا کر پھیلا دیتے اور باری باری بلند آواز سے کہتے جاتے ——— ایک کھاؤں، دو کھاؤں، تین کھاؤں یا سب کی سب کھا جاؤں؟

دھوپ اب اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ جو ساتوں ساتھیوں کے چہروں پر پتلی پتلی سوئیوں کی طرح چبھنے لگی۔ گرد اڑ کر ان کے کپڑوں پر پڑ رہی تھی۔ سُرمہ کی سی دھول میلوں پھیلی ہوئی تھی اور فضا میں مردہ گوشت کی بدبو اس قدر سما چکی تھی کہ چھٹکارا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

اونچے اونچے ناریل اداس تھے۔ کٹھل اور مہوا کے پیڑ اداس تھے آم شہتوت بھی اداس تھے۔ افق افق بھی اداس اداس بلکہ دھواں دھواں نظر آتا تھا۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ مردہ گوشت کی بدبو کا ریلا آ کر گیتا سے ٹکرا گیا اُس نے سوچا پرے جھاڑیوں میں کوئی لاش پڑی سڑ رہی ہو گی۔ یقیناً یہ آدمی کے مردہ گوشت کی بدبو تھی۔ لیکن گدھ یا چیل کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جھٹ اسے پُرانی گالی یاد آ گئی۔ "توڑ موڑا کے چیلے اوکھا بے نا!" یعنی تیری لاش کو چیلیں بھی نہ کھائیں گی۔

جعفری بولا "کیا سوچ رہی ہو گیتا؟"

گیتا نے مڑ کر جعفری کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا تو نہ سکی۔ چلتے چلتے بولی

"معلوم ہوتا ہے یہاں پاس ہی کسی کی لاش سڑ رہی ہے۔"

امجد کہہ اٹھا۔ "لاش ہوتی تو گدھ بھی ہوتے۔"

علی اختر بولا۔ "گدھ نہ ہوتے تو چیلیں ہی ہوتیں۔"

سڑتی ہوئی لاش سے کسی کو کچھ دل چسپی نہ تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ڈر گئے تھے۔ اگر کہیں کوئی سڑتی ہوئی لاش مل گئی تو اسے ٹھکانے لگانے کی مصیبت آ کھڑی ہو گی۔

اپنے کالج میں یہ سب لڑکے خوبصورت لڑکیوں کی تعداد کا خاص دھیان رکھتے تھے۔ کپور کو خوب یاد تھا کہ جب گیتا ان کے کالج میں پہلے روز نام لکھوانے آئی تھی تو وہ کس طرح جھوم اٹھا تھا۔ اس لئے اپنے سب دوستوں کا دھیان گیتا کی ساڑھی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ "خلیج بنگال کی کل نیلاہٹ یہاں جمع ہو گئی ہے۔" اس وقت وہ یہ نہ جانتا تھا کہ ایک دن وہ بھوک موتوں کے اعداد جمع کرنے کے لئے گیتا کی رہنمائی میں ایک ٹولی بنا کر ملک کی خدمت سرانجام دیں گے۔

کپور یہ اعداد جمع کرتے کرتے پہلے اکثر جھنجھلا کر رہ جاتا تھا کسی بھوکے کے منہ میں کچھ ڈالا جائے۔ یا پیاسے کے منہ میں جل کی بوند ٹپکائی جائے۔ تو کچھ خدمت بھی ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بحث چھیڑ دیتا۔ اس کا دماغ اس پگڈنڈی کا روپ دھار لیتا جو گرد کی گہری دھند میں گم ہو گئی ہو۔ گیتا اپنے گلے پر زور ڈال کر کہتی۔ "یہ جو کھاتے پیتے پرانتوں سے بنگال میں اناج آ رہا ہے۔ اس میں بھوک موتوں کی تعداد جمع کرنے کے اندولن ہی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ یہ جو اناج کی گاڑیاں دھڑا دھڑ کلکتے پہنچ رہی ہیں۔ یہ جو ستھان ستھان پر مفت لنگر کھولے جا رہے ہیں۔ ہمارے اس اندولن ہی کی سہائتا سے وچار تو کرو

ہمارے جیسی اور کتنی ٹولیاں بنگال کال پیڑت بھاگوں میں یہ سیوا کر رہی ہونگی اور کپور چپ ہو جاتا۔

"کمیونسٹ پارٹی، جنتا کی پارٹی" گیتا نے نعرہ لگایا۔ اور اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کنواری مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ اور چلتے چلتے سب ساتھیوں نے ایک آواز ہو کر نعرہ لگایا ——

کمیونسٹ پارٹی، جنتا کی پارٹی۔ ان کی بھوک تو کسی طرح دب نہ سکی۔ لیکن یہ بھروسہ بھی کچھ کم نہ تھا کہ کلو پیڑا اداس نہیں رہی۔

کپور کو یکایک ایک فرانسیسی مصنف کا قول یاد آگیا —— عورت کو ایڑی سے لے کر چوٹی تک پرکھنا چاہیئے۔ ویسے ہی جیسے مچھلی دم سے لے کر سر تک جانچی جاتی ہے۔ گیتا بھی ایک مچھلی ہی تو تھی جو خلیج بنگال سے اچک کر دھرتی کی لہروں پر تھرکنے لگی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل اسے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اسی مصنف کا دوسرا خیال اُسے جھنجھوڑ رہا تھا —— ہماری ساری جدوجہد کا مقصد صرف مسرت کی تلاش ہے۔ لیکن کچھ ایسے غم ہیں جن کی موجودگی میں مسرت کے اظہار سے شرم آنی چاہیئے۔ ٹھیک تو تھا۔ اسے اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ کلو پیڑا لاکھ مسکرائے۔ یہاں عشق کا سوال ہی نہ اٹھنا چاہیئے۔

پراشر بولا "کہو کامریڈ کپور، کیا سوچ رہے ہو؟"

کپور نے گیتا کے ہاتھ میں تھمے ہوئے جھنڈے کی طرف دیکھا اور بولا "سوچنے کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ کامریڈ پراشر!"

بھوشن کہہ اٹھا "بھوک ہے۔ اور موت ہے۔ اس سے زیادہ آدمی سوچ ہی کیا سکتا ہے؟"

پھر پراشر نے جاپانی بمباری کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس پر سب ساتھیوں نے

اپنا اپنا غصّہ نکال لیا۔ لیکن فضا برابر مردہ گوشت کی بدبو سے بوجھل تھی۔

یہ ایک چھوٹی سی ریل گاڑی ہی تو تھی۔ اونگھتی اونگھتی چال سے چلتی ہوئی ریل گاڑی۔ لال جھنڈے والی گیتا! اس کے لئے انجن بنی ہوئی تھی۔ یہ سب اُسی کی طاقت تھی کہ ریل آگے بڑھی جا رہی تھی۔ ورنہ سب کے سب ڈبّے ڈھیر ہو جاتے ـــــ بے حرکت مردوں کی طرح! کپور چاہتا تھا گیتا سے بھی آگے جا کر اس ننھی منّی ریل گاڑی کا انجن بن جائے اور اتنا دوڑے اتنا دوڑے کہ سب ساتھی اس کے ساتھ دوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

گیتا نے مڑ کر جعفری سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو کامریڈ؟"

جعفری بولا۔ "وہی جو کامریڈ کپور سوچ رہا ہے۔"

اور اس گاڑی کے سب ڈبے قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بھول گئے کہ انھوں نے صبح سے جل پان تک نہیں کیا یا کیا دھوپ پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی ہے۔

بھوک کے مارے گیتا کا برا حال تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک سُرمہ دانی ہے ـــــ خالی سُرمہ دانی! سرمہ کب کا ختم ہو گیا۔ نام اب بھی سرمہ دانی اُس نے مڑ کر کپور کی طرف دیکھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو ـــــ تم اپنی آنکھوں میں سرمہ کی سلائی پھیرنا چاہو تو میں کہوں گی، معافی چاہتی ہوں۔ کامریڈ کپور!

دھوپ اُنھیں جلا رہی تھی۔ منزل پر پہنچنا ضروری ہے۔ بظاہر وہ چُپ تھے اندر سے یہی چاہتے تھے کہ کسی کھیت کی منڈیر پر اپنے کوکوں کو یوں پھیلا دیں جیسے کسی نے بڑی محنت سے کچھ کپڑے دھو کر ڈال دیئے ہوں۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے جاتے اور پھر سامنے نظر دوڑاتے۔ ابھی منزل دور تھی۔

سب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ گرد کے مارے طبیعت الگ پریشان تھی

کپور گرد کے بادل کو گھورتا ہوا پیچھے رہ گیا تھا۔ من ہی من میں اس نے اسے چار پانچ فحش گالیاں دے ڈالیں۔ پھر وہ بھاگ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ساتھ ساتھ چلنا کسی قدر آسان تھا۔

"پراشر بولا "ذرا گیتا کی ساڑھی تو ملاحظہ کیجئے۔"

کپور نے شہ دی "جی ہاں بہت میلی ہو رہی ہے۔ شاید پوری اٹھنی کے ریٹھے بھی اسے دھونے کے لئے ناکافی ہوں۔"

بھوشن کہہ اٹھا "ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔ مہنگی اور نایاب۔ مہنگے ہی سہی اتنے ریٹھے ملیں گے کہاں؟"

کپور نے الٹ کر پھر کہا "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ ذرا سوچو تو۔ لاہور کے انڈیا کافی ہاؤس میں گیتا ایسی حالت میں چلی جائے تو یقیناً اسے پگلی سمجھ کر نکال دیا جائے۔"

گیتا ہنس کر دوہری ہو گئی۔ بولی "یہ ستیہ ہے کامریڈ کپور! میں کہتی ہوں ریٹھوں سے کہیں ادھک جل پان کی آوشیکتا ہے۔"

کپور کہہ رہا تھا۔ "اچھا بولو گیتا۔ گیتا کیا کھاؤ گی؟ گھی میں تلے ہوئے نمکین کا جو؟"

گیتا جھنجھلائی "تم تو اُپھاس کر رہے ہو۔"

"اُپھاس کیسا؟ میں نے تمہاری دلپسند چیز کا نام لے دیا ہے۔"

"پر گھی میں تلے ہوئے نمکین کا جو؟ سے ادھک سوا وشٹ ہو گی کریم کافی۔"

"کہاں ملے گی کریم کافی؟"

"کڑوی کسیلی کافی کریم کے ساتھ مل کر ایک نیا ہی ذائقہ پیدا کر دیتی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"مجھے یاد آرہا ہے۔ کافی کی مشین کا اونگھتا اونگھتا شور میرے ذہن پر کبھی کبھی ہتھوڑے کی چوٹ کر جاتا تھا۔"

"اوہو! ہتھوڑے کی چوٹ!"

ایک بار سب ساتھی شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ میں الجھ گئے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے گیتا بولی! "بنگال بھوکا ہے۔ ہم بھی تو کئی بار بھوکے رہ جاتے ہیں۔"

بات کو پھر انڈیا کافی ہاؤس کی طرف گھماتے ہوئے کپور بولا "کافی سے زیادہ تمہیں میری باتوں میں لطف آجاتا تھا گیتا! تمہاری غیر حاضری میں میرے روبرو فیض کا مصرعہ اجاگر ہوا اٹھتا ——— گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام۔ ایشن ٹرے میں سگریٹ کی راکھ گراتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی اس سگریٹ کی طرح ہے اور وہ ایشن ٹرے سماں بھومی بن اٹھتی۔"

"خوب خوب!" سب ساتھیوں نے یک آواز ہو کر کہا۔ گیتا نے خاموش داد دی اور پیچھے گھوم کر کپور کی طرف ایک مسکراہٹ پھینک دی۔

کہیں انسان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ ایک برساتی ندی کی خشک تلہٹی پار کرتے ہوئے گیتا سوچنے لگی۔ اچھی فصلوں کے باوجود یہ کال! اس وقت اسکی آنکھوں میں ایک بوڑھے کسان کی تصویر پھر گئی۔ جس کی بھیانک غاروں کی سی آنکھوں میں جھانک کر اُس نے گہرے گہرے سایوں کے پیچھے دیکھ لیا تھا کہ کس طرح موت ایک مادہ ریچھ کی طرح دبکی بیٹھی ہے۔ وہ فن کار ہوتی تو اسے اپنے شاہکار کے روپ میں دنیا کے سامنے رکھتی۔ اس کا نام تو بس ایک ہی ہو سکتا تھا ——— بھوکا بنگال!

معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ کوئی "بات چیت" نہ کر سکیں گے۔ اُن کی رہی سہی ہمت بھی ختم ہو رہی تھی۔ اور کوشش کر لینے پر بھی وہ رینگ رینگ کر ہی چل سکتے تھے۔

ہوا بھی مریل سی معلوم ہوتی تھی۔ کہیں دو گھونٹ پانی بھی تو نہ مل سکتا تھا کیول کو خیال آیا کہ اپنے ساتھیوں پر نکتہ چینی شروع کر دے۔ بھاڑ میں جائے دیش پریم اور کالا ناگ ڈس جائے جنتا کی پارٹی کو۔ شیطان پاٹتا رہے بھوک موتوں کے اعداد کو۔۔۔۔ چوبیس لاکھ ہوئے تو کیا اور تیس یا پینتیس لاکھ ہوئے تو کیا عجب؟ عجب حماقت ہے۔ بھوک موتوں کے اعداد جمع کرنے سے آخر ہاتھ کیا آئے گا؟ وہ چاہتا تھا گھر لوٹ جائے۔ اپنے خیال کو وہ الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ یہ بھی مشکل تھا۔ گیتا کو چھوڑ کر وہ کہیں نہ جا سکتا تھا۔ اس نے ایک مشاعرے میں سنی ہوئی ایک نئی نظم پر غور کرنا شروع کر دیا ـــــ کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکنے لگے دل! کاش وہ خود بھی کسی کارخانے کی مشین ہوتا تاکہ اس کا دل برابر دھڑکتا رہتا۔ اس کا دل تو ڈوب رہا تھا۔ اس کے پاؤں بری طرح بوجھل ہو رہے تھے! اس کا دماغ جواب دینے لگا یہ ٹھیک تھا کہ کمیونزم کے بغیر اس ملک کی تپ دق کا علاج نہیں ہونے کا۔ مگر یہ کدھر کا علاج ہے کہ بھوک موتوں کے اعداد جمع کرتے کرتے خود بھی بھوک کا شکار ہو جاؤ؟ کیو۔۔۔ ۔۔۔ن۔۔۔۔۔ زم۔۔۔۔۔ وہ سوچتے سوچتے لڑکھڑا رہا تھا۔ لیکن جیسے خود کامریڈ لینن اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا ـــــ کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکنے لگے دل! یعنی جب مشین بھی دل رکھتی ہے تو آدمی اپنے دل کو کیوں ڈوبنے دے؟

مٹیلے آسمان پر بادل بالکل نہ تھے۔ ساتوں ساتھیوں کے جسم میں

اتھاہ لاوا پگھل رہا تھا۔ گیتا بولی۔ "ہم اس طرح چلتے رہے تو یہ دھوپ ہمیں آلوؤں کی طرح بھون ڈالے گی۔"

ایک درخت کے نیچے پہنچ کر سب ساتھی گول دائرے میں بیٹھ گئے۔ اور منافع خوروں کو صلواتیں سنانے لگے۔ دھرتی کیا کرتی؟ ایک ایک کر کے یہ لوگ آئے اور گاؤں گاؤں سے سب اناج نکال لے گئے۔ اس دورے میں دیکھے ہوئے درد ناک چہرے ان کی آنکھوں میں پھر گئے۔ ننگ دھڑنگ بچے، مرد بھی سب چیتھڑوں میں! عورتیں بھی سب چیتھڑوں میں۔ لٹکتی ہوئی چھاتیوں سے لٹکتے ہوئے بچے ادھموئے کیا جوان، کیا بوڑھے۔ سب چوسی ہوئی گنڈیریوں کی طرح بیکار۔ ارہر نہیں تو دال کیسی؟ چاول نہیں تو بھات کیسا؟ سب اناج چور بازاروں میں جا پہنچا تھا، زندگی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ لوگ، بے رحم اناج چوروں کی بجائے اپنے دیوتاؤں کو کوس رہے تھے۔ ہاتھ کی لکیروں میں قسمت کی پگڈنڈی ڈھونڈنے والے لوگ زندگی پر جھپٹنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔

سر کے نیچے بازو کا تکیہ بنا کر گیتا ذرا پرے ہٹ کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں مچ گئیں۔ اُس کے ذہن میں اناج چور گھومنے لگے۔ جنھوں نے بنگال کے چھ کروڑ کسانوں کا گلا گھونٹنے کی سازش کی تھی۔ اس کے ہاتھ کسی اناج چور کی مرمت کرنے کو ترس رہے تھے۔ رات ہو جائے اور وہ اپنے چوہے دان کو دھو مانجھ کر رکھ دے۔ پھر صبح کو پتہ چلے کہ موٹے موٹے چوہے اس میں پھنس گئے ہیں۔ پھر وہ انھیں زندہ زمین میں دفنا دے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

جعفری بولا۔ "کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر بھوکے بنگال کی عزت بک رہی ہے کتنی شرم کی بات ہے۔"

امجد کہہ رہا تھا۔ "خود ماں باپ اپنی جوان بیٹیوں کو بیچنے پر مجبور ہیں۔"

علی اختر نے بھی اپنا سُر چھیڑ دیا۔ "دس دس بیس بیس آنے میں جوان لڑکیاں بلیسواؤں کے ہاتھ بک جائیں۔ غضب ہو گیا غضب!"

بھوشن نے نیم رومانی انداز میں کہا۔ "اب تک بیس ہزار کنواریاں بہو بازار میں رات کی رانیاں بن چکی ہیں۔ تعجب ہے!"

پراشر نے اپنی زوردار آواز میں پوچھا۔ "یہ کنواریاں بِک نہ جاتیں تو فٹ پاتھوں پر، بھوک موتوں شکار ہو جاتیں۔"

کپور اب تک چپ تھا، بولا "بھوک کے اس بھیانک سیلاب میں یہ سب کنواریاں ڈوب گئیں۔ غضب ہو گیا!"

گیتا سو رہی تھی۔ کپور نے اٹھ کر اس کی پیشانی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"اُٹھو گیتا، منزل پر پہنچنا تو ضروری ہے۔"

گیتا کا جسم دکھ رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہے۔ تم لوگ آگے بڑھ جاؤ۔ مجھے یہیں پڑے پڑے مر جانے دو۔ میں نہیں چاہتی کوئی میری لاش کو شمشان بھومی میں جلائے۔ میں نہیں چاہتی کوئی میری لاش کو قبر میں دفنائے۔ کوئی بھوکا گدھ مجھے کھا لے گا ——— لیکن اس کے ساتھی اسے کب چھوڑنے والے تھے؟

اپنی ساڑھی کا پلّو اس نے کمر کے گرد کس کر باندھ لیا۔ بولی "اب ہم سیدھی پنکتی میں چلیں گے برابر برابر۔"

"بہت خوب!" سب ساتھی یک زبان ہو کر بولے۔

تین ساتھی دائیں طرف، تین ساتھی بائیں طرف، بیچ میں گیتا۔ لال جھنڈا اٹھائے ہوئے۔ دائیں طرف بالترتیب جعفری، امجد اور علی اختر اور بائیں طرف

کپور، پراشر اور بھوشن۔ وہ کافی اونچی زمین پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہاں سے ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی۔ سامنے کا گاؤں، جہاں انھیں پہنچنا تھا۔ دور ہی سے نظر آنے لگا۔ سب کا حوصلہ نئے سرے سے قائم ہو گیا۔ جیسے سب نے چھاچھ کا ایک ایک گلاس چڑھا لیا ہو۔

سورج اب اتنا گرم نہ تھا کہ پھر سے ان کے جسم میں لاوا پگھلنے لگتا، چلتے چلتے سب ساتھی رک گئے۔ بائیں طرف ایک مور ناچ رہا تھا —— بنگال کے کال سے بے خبر! سب اسے دھیان سے دیکھنے لگے۔ کپور کو غصہ آ گیا۔ حرامزادہ! کس طرح ناچ رہا ہے۔ جیسے شراب پی رکھی ہو۔ سامنے مورنی بیٹھی ہے۔ پٹھا اسے خوش کرنے کے لئے یہ گُر نہ جانے کس سے سیکھ آیا ہے؟ اس کے ہاتھ میں تیر کمان ہوتا تو پہلے ہی تیر سے وہ اس مور کو ختم کر ڈالتا۔ پھر اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ نہیں نہیں، یہ تو ظلم ہو گا۔ وہ اب اس مور کو بتا دینا چاہتا تھا کہ کمیونزم کا پیغام موروں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا آدمیوں کے لئے بلکہ کمیونسٹ سوسائٹی میں تو ایک مور بھی برابر کا حصہ دار ہو سکے گا۔ دوسرے فنکاروں کے ساتھ وہ بھی کسی کلا بھون کی تعمیر کر سکے گا۔ نہ جانے وہ کب سے ناچ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے چمکیلا پنکھا سکڑ گیا۔

ساتوں ساتھی پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ سب نے رومال سے اپنا اپنا چہرہ پونچھ لیا تھا۔ گیتا نے اپنے بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ کپور نے چور آنکھوں سے اس کی سیدھی مانگ کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں کہتا ہوں ہوائی جہاز سے نیچے دیکھنے پر گنگا بھی تو اسی طرح ایک روپہلی لکیر بن کر رہ جاتی ہو گی —— گیتا کی مانگ ہی کی طرح!" اور اس پر سب ساتھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

چلتے چلتے گیتا نے ایک بنگالی لوک گیت چھیڑ دیا ـــــ کتو مانش گورو مورے گیلو، جیشٹھی ماشیر جھڑے، او بھائی جیشٹھی ماشیر جھڑے! یعنی کتنے ہی آدمی اور مویشی مر گئے جیٹھ مہینے کے طوفان میں، او بھائی، جیٹھ مہینے کے طوفان میں۔

پاس سے کپور نے اس گیت کو اٹھا لیا۔ اور دھیرے دھیرے سب ساتھی گیتا کے ساتھ شامل ہو گئے ـــــ کتو مانش گورو مورے گیلو جیشٹھی ماشیر جھڑے، او بھائی جیشٹھی ماشیر جھڑے!..... آج انھوں نے آسمان سے جو آگ برستی دیکھی تھی۔ اس سے تو کہیں اچھا ہو گا جیٹھ مہینے کا طوفان۔ کپور گیتا کی مسکراہٹ کو دعوت دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ مسکراہٹ موت کا سا سناٹا کرتے کرتے اپنی سب مہک کھو بیٹھی تھی ـــــ وہ مہک، جو لاہور کے انڈیا کافی ہاؤس کی فضا میں کپور کی فطانت کو گدگداتی رہتی تھی۔

جعفری بولا "کپور کا افسانہ، کافی ہاؤس کی ایک شام مجھے بہت پسند ہے۔"

گیتا کی آنکھوں میں پھر کنواری مسکراہٹ تھرک اٹھی۔ بوبی "کامریڈ جعفری کے ساتھ میں بھی سہمت ہوں۔ کپور کافی ہاؤس کی ایک شام، میں تم نے مجھے اروشی بنا دیا..... ہاں تو میں پوچھتی ہوں تمہاری لیکھنی کافی ہاؤس سے باہر کب نکلے گی؟"

کپور بولا "میرے نئے افسانے کا نام ہو گا لاش۔"

سب ساتھی چونک اٹھے "لاش؟"

"جی ہاں، لاش۔"

گیتا ذرا دیر سے چونکی "کیسی لاش۔"

کپور نے بڑی سنجیدگی سے کہا "جو نہ جلائی گئی، نہ دبائی گئی"۔

"ضرور لکھو، کپور! اور میں اس کا بنگالی میں الوداد کرنے کا وچن دیتی ہوں"۔

"پہلے ہی سے شکریہ"۔

لاش کا دھیان آتے ہی گیتا کو پھر ساری فضا مردہ گوشت کی بدبو سے بوجھل محسوس ہونے لگی۔ اور ہوا بھی کرایہ کے ماتم داروں کی طرح رسمی طور پر سائیں سائیں کئے جاتی تھی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سارا آسمان اداس اداس نظر آتا تھا ـــــ اُداس اُداس اور بے رنگ، جھاڑیاں خاموش تھیں ـــــ خاموش اور دلگیر!

گاؤں نزدیک تھا۔ جھونپڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ پاس جانے پر معلوم ہوا کئی بوڑھے پیڑ گاؤں کی تاریخ کے امانت دار ہیں۔

اس گاؤں میں ایک جلاہے نے آگے بڑھ کر اس قافلے کا استقبال کیا بنگال مر گیا تو کون زندہ رہے گا؟ سب ساتھیوں نے نعرہ لگایا۔

بڑے بڑے پیڑوں کے اس پار گاؤں کی مسجد بھی خاموش اور دلگیر تھی سارے گاؤں پر نحوست برستی تھی۔ جلاہے نے ایک مریل سا بچہ اٹھا رکھا تھا پتہ چلا کہ یہاں زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ انھوں نے مسجد کے سامنے جمع ہو کر فیصلہ کیا تھا کہ وہ گاؤں کو چھوڑ کر باہر نہ جائیں گے۔

گیتا نے جلاہے کے سمجھنے کے لائق انداز میں اس کی دھیر بندھائی اور پوچھا "یہاں کتنی بھوک موتیں ہو چکی ہیں باوا؟"

پتہ چلا کہ صرف دس آدمی زندہ ہیں۔ آٹھ دوسرے آدمی۔ اور دونوں یہ باپ بیٹا۔ وہ بھی جلد جلد مر جائیں گے۔ اُس نے بہت مشکل سے جواب دیا۔ اور اب وہ آنسوؤں کے سیلاب کو نہ روک سکا۔

گیتا نے کہا "روتے کیوں ہو؟ ہم تو تمہارے سیوک ہیں باوا؟"

کپور بولا "اب جلدی کرو گیتا!"

گیتا نے دھیرے سے کہا "ہاں کامریڈ! بس ابھی شروع کرتے ہیں۔"

فیصلہ ہوا کہ پہلے زندہ لاشوں کا ملاحظہ کیا جائے۔ دو آدمی ستر سے بہتر معلوم ہوتے تھے۔ جیسے جونکوں نے ان کا سب خون چوس لیا ہو۔ ایک جھونپڑی میں ایک بارہ سالہ یتیم چھوکرا دم توڑ رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک پڑوسن خدمت کو موجود تھی۔ جواب اپنے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ یہی بڑھیا بیچ بیچ میں اٹھ کر اُن ستر سے بہتر سے بوڑھوں کے..... منہ میں پانی ٹپکا آتی تھی۔ ایک جگہ ایک ننھا اپنی ماں کی چوسی ہوئی گٹھلیوں جیسی چھاتیوں کو برابر چوستا جا رہا تھا.... اب اور ہمت کس میں تھی کہ ان بھیانک جھانکیوں میں الجھا رہتا۔

ساتوں ساتھیوں کا قافلہ اب قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اپنا اپنا سامان سب نے جلاہے کی جھونپڑی میں چھوڑ دیا تھا۔ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے وہ جلاہا اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

گیتا نئی قبریں گنتی جاتی تھی اور کپور رجسٹر پر اعداد چڑھاتا جاتا تھا۔ اس تندہی سے تو کوئی تاریخ کی گزری ہوئی صدیوں کو بھی نہ گنتا ہوگا۔

قبرستان کے ساتھ ساتھ ایک دریا بہہ رہا تھا۔ نئی قبریں ختم ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ وہ جلاہا ساتھ نہ ہوتا تو نئی اور پرانی قبروں میں کچھ مغالطہ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اب تو کسی غلطی کا امکان نہ تھا۔

"یا اللہ" جلاہا غمناک آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ یہ اُس کی بیوی کی قبر تھی۔ گیتا نے اس کی دھیر بندھائی۔ اور وہ ہانپتے ہوئے بیل کی طرح چل پڑا۔

اب تک گیتا ایک ایک قبر کے پاس پہنچ کر پوری ہوشیاری سے اعداد و شمار کے ہندسے لکھواتی جاتی تھی۔ اب اتنا صبر نہ تھا۔ اب وہ دور ہی سے گنتی کر لیتی اور یہ بھی ضروری نہ رہ گیا تھا کہ ہر حالت میں جلاہے کی تصدیق کے بعد ہی گنتی کو درست سمجھا جائے۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ باقی کا قبرستان صرف نئی موتوں کے سبب بڑھتا چلا گیا تھا۔

وہ جلاہا اجازت لے کر واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ کہہ گیا کہ وہ اپنے قومی خدمت گاروں کے لئے تھوڑے سے دال بھات کا انتظام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ موت تو آئے گی ہی۔ پرسوں نہیں تو کل۔ زیادہ فکر تو آج کی ہے۔ مہمان نوازی تو ضروری ہے۔

ساتوں ساتھی آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے۔ ایک دلدوز بھیانک چیخ فضا میں گونج رہی تھی۔

اب وہ قبرستان کی آخری سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک کونہ تھا ــــــ ٹھیک ساٹھ کا زاویہ بنا ہوا تھا۔

سامنے ایک قبر پر سپید بالوں والی ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ گیتا بولی۔ "ہم کھدھامرتیو کے انک پراپت کر رہے ہیں، ماں!"

"کھدھامرتیو کے انک!" یہ کہہ کر بڑھیا نے پھر گستاخ قہقہہ لگایا۔

"جنتا کی لال پارٹی کی سیوا ہمارا آورش ہے، ماں!"

"لال پارٹی!" بڑھیا نے پھر گستاخ قہقہہ لگایا۔

"ماں، ہنسو مت۔ ہم تو کھدھامرتیو کے انک پراپت کر رہے ہیں۔ ہم نے جل پان بھی نہیں کیا۔ پگھلانے والی دھوپ بھی ہماری راہ نہیں روک سکی۔ ہم یہ گنتی سماچار پتروں کو بھیجتے ہیں۔ اور اناج کی گاڑیاں دلیش کے کھاتے پیتے

بھاگوں سے کلکتے پہنچ رہی ہیں۔ اور ستھان ستھان پر پھوکٹ لنگر کھولے جا رہے ہیں، ماں!"

"پھوکٹ لنگر!" بڑھیا نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ماں! ہنسو مت۔ ہم تو نویں قبر میں گن رہے ہیں، ماں!"

بڑھیا چپ ہو گئی۔ اُس نے قہقہہ نہ لگایا۔ بولی "گن لو نویں قبریں، راج کنیتا!"

"ہاں، ماں!"

"یہ کدھر کا اپائے ہے، راج کنیتا؟" وہ سپید بالوں والی بڑھیا وحشیانہ انداز سے کہہ رہی تھی۔ "قبریں گن کر کھدھا مرتیو کے انک پراپت کرنا تیاگ دو، راج کنیتا!"

"کیوں ماں؟"

پتہ چلا کہ قبروں سے دُگنی لاشیں تو دریا میں پھینکی جا چکی تھیں۔ اور ایک بات اور بھی تو تھی۔ اس قبر میں بڑھیا کے دو بیٹے پلوں کی طرح سوئے پڑے تھے۔ اس کے چار بیٹے اور بھی تھے۔ وہ بھی بھوک کے بیمار تھے۔ ایک دن وہ بھی ایک ساتھ مر گئے تو وہ اُن کے لئے ایک بھی قبر نہ کھود سکی۔ انھی ہاتھوں سے اس نے انھیں دریا میں پھینک دیا۔

گیتا بولی۔ "اس مرتیو کا پارا وار نہیں ہے سنسار میں۔ پر ہم بھی تو تمہاری سنتان ہیں، مان!"

اب وہ بڑھیا رو رہی تھی۔ اُس کی دھیر بندھانے کی طاقت گیتا میں تو نہ تھی نہ جانے کتنے دنوں سے وہ اس قبر پہ دھرنا دیئے بیٹھی تھی۔ جیسے اب اس نے موت پر جھپٹنے کا ارادہ کر لیا ہو۔

قافلہ لوٹ پڑا۔ سامنے پچھم میں سورج ڈوب رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک خونی ہے۔ اور ان گنت لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر افق میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ گیتا نے مڑ کر اُس بڑھیا کی طرف نگاہ پھینکی اور ایک بار پھر کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے بھوک کے ماروں کی چیخ و پکار اس کے کانوں میں زندہ ہوا اٹھی ..... سرپ نیشے کھدھا !..... آمار پوڑا کو پال !..... ابھاگا کون دکے جائے !..... پوچے مر..... پوڑا پوڑے مر..... یعنی سرپ ناش کرنے والی بھوک... ہمارا جلا ہوا بھاگیہ !..... ابھاگا آدمی کس طرف جائے ؟..... سڑ کر مر ..... کیڑے پڑ پڑ کر مر !..... اور وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ اس کے پیچھے کپور تھا۔ وہ پراشر اور بھوشن اور ان کے پیچھے علی اختر، امجد اور جعفری معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساتوں ساتھی اُس بڑھیا کے ساتوں بیٹے تھے۔ جو دھرتی اور پانی کی قبروں سے اٹھ کر چلے جا رہے تھے۔ آگے ہی آگے، نئے پھوڑوں کی طرح اُبھری ہوئی قبروں کے بیچوں بیچ !

—— + ——

اختر شیرانی

فاقہ کشانِ بنگال

خوں رُلاتا ہے غمِ فاقہ کشانِ بنگال
اشک بنجاتی ہے آنکھوں میں فغانِ بنگال!

کس کو پرواہی سُنے کون فغانِ بنگال
قہرِ بنگال، بہر حال، بجانِ بنگال!

سلک و ریشم تھا گراں جن کے بدن پر اک دن
آج عُریاں ہیں وہی سرو قدانِ بنگال!

صرصرِ قحط و وبا، آفتِ سیل و طوفاں
اک مصیبت میں نہیں کشتیٔ جانِ بنگال!

آہ بھی، بھوک کے مارے نہیں آتی لب تک
کوئی کیونکر سُنے فریاد و فغانِ بنگال؟

قحط کے ساتھ یہ سیلاب، خبر دیتے ہیں،
موت بھی روتی ہے، اب بہرِ بُتانِ بنگال!

ملک کے واسطے مرتے تو کوئی بات بھی تھی
غیرت! اے مرگِ مصیبت زدگانِ بنگال!

پیاری اولاد کی قیمت ہوں فقط دو لقمے!
رحم! اے خالقِ کل گرسنگانِ بنگال!

جن فضاؤں میں مچلتے تھے کبھی نغمۂ تر
اب تڑپتی ہے وہاں آہ و فغانِ بنگال!

بھوک کی آگ ہی میں جل بُجھے جلنے والے
نہیں محتاجِ چتا، فاقہ کشانِ بنگال!

ابر کے پردے میں گم ہے فلکِ نیلی پوش
کہ کفن مانگ نہ لیں، بے کفنانِ بنگال!

اختر اربابِ وطن رہ نہیں سکتے خاموش
حالِ بنگال سُنیں گر بزبانِ بنگال!

—+—

اختر اورینوی

جنگل

سوچنا آدمی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ بلکہ مصیبتوں کی جڑ، کوفت، پریشانی، الجھن، نیکی بدی کی ناپ تول، عمل اور مقابلہ کی شاخیں اسی ایک سوچ سے پھوٹتی ہیں۔ دنیا بھر کی زحمتوں کے جنگل اسی درخت میں گھونگرو کی طرح لگتے ہیں۔ اس شجر کا پھل کھا یا اور امن چین کی جنت سے نکالے گئے۔ میں آرام و آسائش کا قائل ہوں۔ غمِ دنیا اور فکرِ عقبیٰ کے بغیر سکون کی بنجی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں، مرنجاں مرنج۔ نہ میں کسی کے پھٹے میں پاؤں ڈالوں اور نہ دوسروں کی خدائی فوجداری کو پسند کروں میری زندگی بھی کچھ اس طرح گزری کہ سکون و آرام کی عادت ہو گئی ہے۔ میں اپنے جسم، دماغ و روح کو تسکینِ مکمل کی حالت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ سوچ بچار اس مقصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سکون سوچ کی نلکیوں سے گزرتے ہی دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔ لہذا میں سوچنے سے سخت گھبراتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکھ چین چاہنے والے سبھی لوگ اس بلا سے دامنِ خیال کو بچا کر رکھتے ہوں گے۔ اب فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ میں سوچنے کے مرض میں خاصہ گرفتار ہوں۔ پڑوس کے ریڈیو کے شور و شر اور بانگِ بے ہنگام کو آپ پسند کریں یا نہ کریں، آوازیں چیخیں اور اعصابی دوروں کی لہریں دنیا بھر سے سمٹ سمٹا کر چلی آئیں گی۔ اور سیدھے آپ کے دماغ میں گھس کر ابتری پھیلائیں گی۔ بالکل یہی

خیالات کی لاسلکی، کا عالم ہے۔ لاکھ فکر کے دریچے بند کیجئے، سوچ پہرے بٹھائیے مگر دماغ کا ریڈیو سٹ ہر وقت جھنجھناتا ہی رہتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اسی ریڈیو سٹ کے مالک ہیں، سوئچ کو بند کر دیں گے، چلو چین نصیب ہو جائے گا۔ مگر یہ سوچ کر سر چھوڑ لینے کو جی چاہتا ہے کہ کھوپری کے اندر کے ٹیڈیو پر مالک کا کوئی قبضہ نہیں، اس کے "والو" ہمیشہ، ہر آن برق زدہ رہتے ہیں۔ نیند میں بھی تو نجات نہیں ملتی۔ خواب کے بہروپ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کی بجلیاں گرتی رہتی ہیں۔ جاگتے ہوئے اور کچھ نہیں تو یہی سوچتے گزرتی ہے کہ سوچ فکر سے کیسے بچیں کہ دل کو طمانیت حاصل ہو۔

میں بہت کم لوگوں سے ملتا جلتا ہوں۔ ملنے جلنے سے بھی لوگوں کے دکھ سکھ کا پتہ چلتا ہے۔ اور پھر وہی سوچ ملنے ملانے اور سوچ بچار سے اتنی زیادہ نفسی قوت ہر وقت برباد ہوتی رہتی ہے کہ اس کا اندازہ کر کے سوہان روح ہوتا ہے۔ ان چھوٹے بڑے ذہنی و نفسی زلزلوں سے عمر کی عمارت کے گوشے منہدم ہوتے رہتے ہیں اور سکون اضطراب میں مبدل ہو جاتا ہے۔ انسان کی جنّت ایکانت کی زندگی میں ہے اگر مجھے تہذیبِ تمدن کے جدید سامانوں کی عادت نہ ہوتی تو میں براگیوں اور جوگیوں کی طرح کسی جنگل کے کنج یا پہاڑ کی گھپا میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنا پسند کرتا۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ عیسائی رہبان جو صحراؤں بیابانوں میں چین کی زندگی گزار دیتے تھے!

اخبارات، رسالے اور یہ کمبخت علمی کتابیں! ان سے پیچھا چھڑانا مشکل! مذہبی کتابوں کی ہاں نہیں سے تو خدا خدا کر کے چھٹکارا ملا تھا۔ تدبر و تفکر کی آسمانی دعوتوں سے نجات ملی ہی تھی کہ سیاسی نعروں اور اقتصادی پکاروں نے کان کے پردے پھاڑ دیئے اور جنت کی فکر میں ہی جنّت غارت ہو گئی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح ان واہیات شور و شر سے دامن بچایا تو پراس کو کیا کروں کہ تفریحات میں بھی

پروپیگنڈے کی لِم لگی ہوئی ہے۔ بسکٹ اور مکھن کے ٹینوں تک پر۔

"حفاظتی بچت کے سرٹیفکیٹ خریدو" کی چیخ چسپاں۔ معاذاللہ! اسفرشکل، قیام مصیبت! کھانا پینا زہر! چائے کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ دوسروں کے غم کا بِس اپنے حلق سے نیچے اتارئیے۔

خیالات کی زد اور سوچ کے بھنور کی گردش شہروں میں زیادہ بلاخیز ہوتی ہے کاش کوئی شہروں سے ان لعنتوں کو سمیٹ لیتا! لپیٹ کر تہہ کر کے رکھ دیتا! نہیں انھیں کفن پہناتا اور چتا بنا کر آگ لگا دیتا! تمدن کی رحمتوں اور برکتوں میں بھی ان کی وجہ سے کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ کسی چیز کا لطف باقی نہیں رہتا۔ جینا اجیرن ہو جاتا ہے۔ برف لگے ہوئے شربت کھولتے پانی کے گھونٹ، فرنیاں اور پڈنگ دوزخ کا پیپ اور مکھن لگے ہوئے توس تھوہڑ اور سلیج کے خاردار، موٹے، مکروہ پتے بن جاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں، دہکتی ہوئی سیخیں اور نرم و نفیس قالین تپتا ہوا تانبا بن کر عذابِ جان! دُنیا کتنی حسین ہے! یہ ارضی جنّت خیالی نہیں، وعدۂ فردا نہیں! دسترس کے اندر، عُریاں و رقصاں، خندہ و نازاں! مگر سوچ کا یہ سانپ، یہ گھناؤنا، لپلپاتا ہوا، انگاروں جیسے چھوٹے، گول گول، بے حیا، نفرتِ انگیز دیدے نکالے ہوئے سیلا سیلا سا، رینگتا ہوا، چور، فریبی سانپ! خاموش اور پھر بھی زبان دراز، ناسور کے لجھڑ اور برچھی کی انی کی طرح روح کو کھرچنے، دماغ کو سڑانے اور دل کی حرکت روک دینے والی ظالم زبان! جنت اور سانپ کا اجتماع ——— یہی آدم کا سب سے بڑا مسئلہ، سب سے بڑی مصیبت سب سے بڑی لعنت ہے۔

میں شہر کی رہائش پسند کرتا ہوں۔ عدم اور موت کے سیاہ، لامعلوم، اتھاہ، خاموش سمندروں کے درمیان حیات کے چھوٹے سے روشن، شناسا، چونچال جزیرے میں پیاری مطلوب، قیمتی مگر گریزاں۔ زندگی کے تشنۂ احساس، بھوکے

جذبات اور ترساں خیالات کو شاد کام کرنے اور تسکین پہنچانے کے لئے شہر کا رچاؤ اور سنوار ارمغان بہار ہے۔ لیکن اس المناکی کو کیا کروں کہ بہار کی نزہتوں سے ہمزاد کی طرح لرزا دینے والی ایک تنبیہہ لپٹی ہوتی ہے۔ زندگی کی خوش آیند رنگ رلیوں کے عقب میں بے پایاں ناکامی جھانکتی رہتی ہے۔ نغمات کی موجوں کی اوٹ میں سوچ رینگتا ہوا آتا ہے اور جام نوشیں کی رسیلی لذتوں میں خوں جما دینے والا سم قاتل گھل مل کر سانس کا گلا گھونٹے ڈالتا ہے۔

کاش کوئی خدا ہوتا تو میں اُس سے رو رو کر دعائیں کرتا۔ ان نامراد اسرائیل کے بیٹوں کی طرح چیخ چیخ کر التجائیں کرتا جو صدیوں سے ہیکل سلیمان میں دیوار گریہ کے بے فیض سائے تلے اپنے سر پھوڑتے ہیں۔ اور کہتا کہ اے خالق میری فطرت کے تضاد کو دور کر دے یا سوچ کے عظیم و بے درد بوجھ سے میرے زخمی و دریدہ ذہن کو نجات بخش۔

حیاتِ تمدن مجھ سے علیحدہ ہوتی جاتی تھی۔ اور میں اس سے بے پناہ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی جدائی! جنگ و پیکار کی تُک سے میں بچتا ہوں۔ اُف یہ عالم! یہ قوموں کا جنگل! یعنی ایک منظم بے قانونی! مگر اس کے باوجود جنگل کے کانٹے میرے پائے خیال میں گڑتے ہی رہتے تھے۔ پسپاہی، زمین سوزی، اپنے سامانوں کو آپ جھلسنا، قحط اور راتب بندی، حملے اور بمباریاں، یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھے۔ سامانوں کی کمی کا گلہ اور بنے بنائے سامانوں کی تباہی خیر جو بھی ہوتا۔ مگر میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا کہ میری جنّت مجھ سے چھین لی گئی۔ مجھے شہر کی زندگی کھلنے لگی اور میں نے مجبوراً ہجرت کی۔ سکون کی تلاش میں۔ سوچ کے کچوکوں سے بچنے کے لئے۔ مگر مجھے کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑی! میں کیا چاہتا ہوں مجھے نہیں معلوم۔ سکون افزا موت یا مضطرب دھڑکتی ہوئی بنی سنوری زندگی؟ دھڑکنوں

کی آواز سے سوچ جاگ ہی اٹھتا ہے۔ سکون سوائے موت کی آغوش کے اور کہیں نہیں ملتا۔ شاید اور میں انہونی کی طلب میں، زندگی اور سکون کے اتحاد کی طلب میں گھلتا رہتا ہوں، کڑھتا رہتا ہوں، اور جان سوز کپکپی کے عالم میں آرزو و یاس کی تلواریں چلتی دیکھتا رہتا ہوں۔

میں شہر سے دیہات چلا، دلگیر محزوں، اُداس۔ میرے بہشت میں سانپ گھس آیا تھا۔ شہر کے گمشدہ آرام و آسائش کا تصور۔ اُس کی گلکاریاں و دلداریاں ناکام بلاوا بن کر فراق کی اداسیوں کو بے چین اور پائندہ بنا رہی تھیں۔ راہ میں بجلی کے کھمبے حسرت زدہ ٹکٹکی کے ساتھ مجھے گھورتے تھے۔ مگر جب میں تاروں کو دیکھتا تو وہ جنجال بن کر میرے کو کسنے لگتے۔ پھول، سینٹ، کریم اور لوشن کی خوشبوئیں کراہ کراہ کر دم توڑتی جاتی تھیں۔ اور اب کڑوا تیل اور کراسن تیل کی فکر دماغوں میں بسی ہوئی تھی۔ ہوٹلوں کی نازاں چشمکوں کی یاد کے ساتھ گیہوں کے نایاب دانوں کے بندلب کسی بے درد و گریزاں دوشیزہ کی طرح خاموش طنز کرتے ہوئے قطار اندر قطار گزرتے جاتے تھے اور میں انھیں قطاروں کے درمیان اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ نغمات موسیقی کے تار جنگی نمائش کے ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ اور پھٹنے والے بموں کی سمع خراش دھماکوں سے جھنجھنا کر ٹوٹے جاتے تھے۔

میں اسٹیشن پہنچا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں آدمیوں کا ہجوم تھا میں اس ہجوم میں بالکل بے گانہ تھا۔ بہت سے خیالات میرے دماغ میں گڈمڈ کر رہے تھے۔ مگر اس بھیڑ بھڑکے میں جنگی نمائش کا شور سب خیالات کو کچل کچل کر پیش منظر میں چلا آتا تھا۔ میں سوچتا رہا سوچتا ہی رہا کہ آدمی ابھی تک اپنے دانتوں اور ناخنوں کی نمائش کرتا ہے۔ ہاتھی کے دانت، گینڈے کے پشتانے اور سنگین شیر کے پنجے، اور ان جنگلی جانوروں کی چنگھاڑیں، چنچم چاخ، دھوم، گرج سب

تاریک نہاں خانوں سے نکل نکل کر چلے آتے تھے۔ اندھیرے اور دھندلکے کے حاشیئے پر ایک نمائش برپا کرنے۔

شہر کب کا پیچھے چھوٹا۔ دماغ کے اندر کئی پرواز اور کئی دھماکے ہوئے شہر مسمار ہوگیا۔ مگر گرتی ہوئی دیواریں، اڑتی ہوئی چھتیں اور انسانوں کا غم انگیز سکوت میں ڈوب جانے والا ہجوم یہ سب مٹ کر اور زیادہ پائندہ ہوگئے۔ یاد کبھی سامنے کی حقیقتوں سے بڑھ کر موجود، نگراں، گویا اور اثر خیز ہوتی ہے۔ ذہن میں ماتمی نغموں کی ہچکی لیتی ہوئی سرسراہٹ سی تیر گئی۔ بہت دور جب دوسرے جنکشن میں گاڑی جھٹکے کے ساتھ رکی تو ہچکیاں، سرسراہٹیں اور یاد سب دماغ سے لڑھک کر باہر چلے گئے۔ میں خالی الذہن سا ہوگیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے بیکراں آزادی اور سبکساری کا امن پرور احساس ہوا۔ جھٹکے بھی بعض دفعہ روح کے بار کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ اسی احساس کی لامحدودیت کچھ کم ہوئی تو میں بھی بچپنے کی فراغت سی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر ایسی ساعتیں ابدی ہوسکتیں تو پھر کیا ہوتا!

میں پلیٹ فارم پر اترا۔ ہوٹل کے بیرے کو آواز دی اور کاغذ کے یقینی حصول کی طمانیت کا پس پردہ احساس لئے سیٹیاں بجانے اور گنگنانے لگا۔ ٹرے میں شفاف خوان پوش سے ڈھکی ہوئی چپاتیاں، شامی کباب اور قورمے کی پلیٹیں لائی گئیں۔ پلیٹ فارم کے مخالف جانب دریچے سے لگ کر میں کھانا کھانے میں مشغول ہوگیا۔ مگر چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دریچے کے نیچے ریلوے لائن کی سطروں کے درمیان کچھ الفاظ گونجے۔ یہ گونج شور میں تبدیل ہوگئی۔ جیسے کتّے کے پلّے لڑ رہے ہوں۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ نیچے ایک دو پھینکے ہوئے پتّلوں کے گرد ایک بچّہ اور چند لڑکے چھین جھپٹ اور چخ پخ کر رہے تھے۔ پتّلوں پر غذا کے کچھ اثرات باقی تھے۔ بس اُسی رمق حیات کے قبضے کے لئے اٹھا پٹک

ہو رہی تھی، ہاتھا پائی اور گالی گلوچ۔ ایک درجن لڑکے ہوں گے جو مختلف دریچوں کے نیچے بھیک مانگ رہے تھے اور بھوکے گرگ بچوں کی طرح جھوٹے ٹکڑوں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ اب وہ میرے ڈبّے کے پاس آکر الجھے ہوئے شور کناں تھے۔ لنگوٹی چپکائے ہوئے ننگے، نحیف و زار لڑکے۔ حریص، ندیدی آنکھیں، بے حیا بے غیرت، ڈھیٹ! میرے دل میں نفرت پیدا ہوئی۔ جیسے دودھ کھاتے کھاتے اس میں سے کالی سی مکھی نظر آجائے۔ اپنا ایک پیر اندر ڈالے اور ایک باہر نکالے ہوئے ٹانگ کراہیت خیز انداز میں ہلاتے اور گول مرچ جیسی ابھری ہوئی آنکھیں نکالے ہوئے۔ دریچے کے نیچے وہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، کلبلا رہی تھیں اور میں گھن سے آنتوں میں اینٹھن اور معدے میں اُبال محسوس کر رہا تھا۔ اُن بھیڑیوں نے اپنی نظر سے مجھے کھانا شروع کیا۔ میں نے گھبراہٹ، نفرت اور خوف سے آدھا پیٹ ہی کھا کر باقی چپاتیاں اور قورمہ غصّے سے نیچے پھینک دیا۔ ایک جھپٹ ہوئی کالے کالے چیونٹے گتھ گئے۔ اور اپنے ٹانگر مانگر بے صبری کے ساتھ ہلاتے رہے۔ جیسے مقناطیس سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ذرّے چپک کر گنجان قماش بنائیں۔ سوائے ایک چھوکرے کے سبھوں کو اس لوٹ کھسوٹ میں کچھ ٹکڑے مل ہی گئے۔ اور ایک پانچ سالہ بچّہ دور ہی دور سے اس گتھی کے گرد منڈلا رہا تھا۔ محروم چھوکرا پیلا پیلا کمزور سا تھا۔ وہ دانت کٹکٹاتا ہوا سبھوں کو تک رہا تھا۔ اور دوسرے لونڈے اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ تلملا اٹھا۔ اور بڑھ کر اس نے ترساں بچّے کو بلاوجہ ایک طمانچہ مار دیا۔ بچّہ بوکھلا کر اپنے گال ملنے لگا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں منجمد آنسوؤں کے نشتر جھلک رہے تھے۔ اور گھٹے ہوئے درد کا دھواں منتقم بھوک کی طرح منڈلا رہا تھا۔ بے کسی اُسے اپنی گود میں لئے ہوئے تھی۔

میرے دماغ کی لاسلکی کا سرا دُنیا کے کناروں سے مل گیا تھا۔ میں تلاشِ

سکون میں شہر چھوڑ کر دیہات جا رہا تھا! مگر یہ بھوکے چیونٹے اور چوٹ کھائے ہوئے کلّے! ایک اسٹیشن بعد میرا دیہات آنے والا تھا۔ دیہات کی معصومیت زد پر تھی۔ خیر دیکھا جائے گا۔

خیالات میرے دماغ میں شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ رہے تھے کہ ایک صاحب ڈبّے میں وارد ہوئے! انجمن بہ کنار۔ جلو میں کئی ٹرنک اور آدھے درجن ماروا ڑی، ہمگیرے (ہولڈال!) اور موٹے بنیئے، چپراسی اور کوکر، توشہ دان، ایک نہایت ہی بالغ ٹفن کیریر، ایک کہنہ پیش کار، بہت سے فائل، ایک درجن قلی، خربوزوں کی ٹوکری، وسط میں صدر الصدور قسم کا ایک بالیدہ سبز تربوز۔ بہت سے عملے فعلے اور پس منظر میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے والے کئی تماشبین۔ یہ ریوڑ اپنے اندر اتنی ٹھوس مادیّت رکھتا تھا کہ میرے تخیلات و تفکرات لنے بھی ان کا سہارا لیا۔ جیسے فضا کے خاکی ذرّات سے گرم و پریشان آبخرے ٹیک لے کر بارش کے ٹھنڈے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے تپاں دماغ کو سکون ہوا۔ اس سرکس کی کمپنی کا رِنگ ماسٹر بہت دبلا پتلا شخص تھا۔ سونے کی نفیس عینک لگائے اور لنسر کا خوش تراش سوٹ پہنے گال پچکے ہوئے اور آواز میں افسرانہ پندار۔ آپ اسٹیشن سے ملحق علاقے کے سب سے بڑے آڑھتوں کے کنٹرول شاپ اور دوسری بیوپار کے لائیسنسوں کے اجرا کی تحقیقات میں ہفتوں سے وہاں ڈاک بنگلہ میں بھان متی کا کھمبہ جوڑے فروکش تھے۔ چور بازار کے متعلق رپورٹوں پر بھی آپ کو فیصلہ صادر کرنا تھا۔ چاول پیدا کرنے والے اس زرخیز علاقے میں یک بہ یک غلّہ الوپ ہو گیا اور خلقت بھوکوں مر رہی تھی۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی اس منحنی مگر بلا کے باتونی افسر نے اہل ڈبّہ سے باتیں شروع کر دیں اور خواہ مخواہ اپنے وجود اور اس کے متعلقات سے سارے لوگوں کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھا۔ اور اس

اہمیت کے ساتھ کہ آپ حیات کے محور ہیں، جتنا کہ ان داتا اور آپ کا عرفان کمزور محتاج دنیا والوں کی تنہا راہِ نجات ہے۔ آپ ڈبّے میں سرگرم سخن تھے اور ڈبّے کے دروازے کے قریب پلیٹ فارم پر مارواڑی اور بنیئے فربہ اندام پیش کار سے کانا پھوسی میں منہمک تھے۔ چپراسی بھی ادھر ادھر کھسر پھسر کرنے میں مشغول تھا۔ پہلے تو مجھے لطف آیا تھا۔ مگر تابڑ توڑ باتوں سے میں اکتا گیا۔ باتوں سے زیادہ اس بے پناہ "وہم" سے جو پھیل کر جارحانہ انداز میں، اور دوسرے لوگوں کے وجود کو سکڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میری ہستی بھی چپک کر تنگی محسوس کرنے لگی۔ "ہم" بڑھتا گیا، پھولتا گیا، بے پروا اور "صرف ہم اور کچھ بھی نہیں"۔ ہو کر دلدوز جانگسل بن گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں فضا کی وسعتوں میں — پناہ ڈھونڈنے دریچے سے باہر ریلوے یارڈ اور کھیتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ غیر کے "ہم" نے میرے "ہم" کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

میں نے ریلوے یارڈ کے بعید ترین حصّے میں ایک ٹھیری ہوئی مال گاڑی کے نیچے چند تاریک سایوں کو رینگتا دیکھا۔ یہ سائے باہر نکل آئے اور ابھر کر کالے کالے دیہاتی چھوکروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ یہ تیندوے کی طرح چوکنا، آہستہ خرام، سمٹے سمٹے، جھکے جھکے ایک مال ڈبے کے سامنے آئے۔ ایک نے کسی نوک دار لانبی سی چیز کو ڈبے کے دروازے کے نچلے جوف میں ہلایا۔ پھر ایک ہرکج سی دی۔ سفید دھار سی چھوٹی۔ چھوکروں نے اپنے اپنے پھٹے میلے گمچھے سامنے پھیلا دیئے اور دھار کے رُکتے ہی یہ لے وہ جا۔ مال گاڑی کے نیچے سے نکل کر یارڈ کے باہر کھیتوں میں تیر بھاگے۔ میرے ڈبے کے دوسرے مسافر بھی اس طرف دیکھنے لگے۔ سامعین کی توجّہ کا ہٹنا، افسر کی "ہم" کے لئے تکلیف دہ تھا۔ مگر وہ بھی باہر دیکھنے لگا اور پھر زور کا قہقہہ لگایا۔

"اُرے یہ اچکے چور لومڑ چھوکرے گاؤں کے کنگال ہیں۔ مال ڈبوں میں لدی آلے ٹے کی بوریوں میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ آٹا جھر جھر گرنے لگتا ہے اور یہ بدمعاش اسے لے بھاگتے ہیں۔ میں نے یہ تماشے بہت دیکھے ہیں۔ دوروں میں مزہ اس وقت آتا ہے جب چوکیدار انھیں پکڑ پاتے ہیں۔ پھر تو یہ لونڈے ایسا ٹھکتے ہیں کہ بس۔ وہ کھال اُدھڑتی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ مگر یہ سور باز کب آتے ہیں۔ کتنا نقصان ہوتا ہے اس سے ذرا سوچیئے تو۔ اگر پتہ نہ چلا تو پھٹی ہوئی بوریوں سے آٹا راستے بھر گرتا جاتا ہے۔"

گاڑی کھل گئی۔ آلے ٹے کی دھار اور پھیلے ہوئے دامن میرے تصوّر میں ناچتے اور افسر کے قہقہے دماغ کو جھٹکے دیتے رہے۔ میں بہت جلد اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ بہر کیف دو گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ ہی گیا ——

ساحل سکون!

زندگی کی سانس دیہات میں دھیمی تھی۔ اس کا انگ بے رس، اس کا روپ کم رنگ اور اس کے ڈھنگ میں رچاؤ اور سنوار نایاب۔ بول پھیکے اور چال اناڑی۔ مگر اس خاموش ٹھیراؤ نے سوچ بچار کو بھی سکتے میں ڈال دیا۔ وہاں فکر کے شعلے بھی بجھ گئے، جیسے مریض عضو کے گرد برف لپیٹ کر جسم کے کیسوں کے ساتھ جراثیم کو بھی نڈھال کر کے فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح حیات کی گھما گھمی کے ساتھ ساتھ حیات کا سوچ فکر بھی گاؤں میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ سوچ کی پیہم خراش سے بچنے کے لئے مجھے کڑے دام ادا کرنے پڑتے تھے۔

پر تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ گاؤں زندگی کا مقبرہ نہیں۔ وہاں بھی زندگی کی نبض چلتی ہے، دل دھڑکتا ہے۔ آہستہ مگر یقینی،

گاؤں جیون کی کوکھ ہے۔ ہستی کا عظیم رحم۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ سوچ کا سانپ کہیں حیات کے اس گہوارے میں نہ آجائے! مگر میرا خیال ہی خیال رہا۔ دماغ کے زخم وہ فکر کی کھرچیں بھرنے لگی تھیں۔

ایک دن مبہم سا خوف دھوئیں کی ریکھا کی طرح رینگتا ہوا میرے ذہن کے صاف آسمان کو ملگجا کر گیا۔ گھر میں لپائی کا کام کرنے مسٹر ھنیوں کو بلوایا گیا۔ وہ نہ آئیں۔ میرے والد صاحب کے کارندے مسٹھروں پر بہت برسے اور ایک کی پٹائی بھی ہوئی۔ دوسرے دن ایک مسٹر ھنی آئی۔ وہ اکیلی بھلا کیا خاک لپائی کرتی مسٹھر پھر پکڑ بلوائے گئے۔ مار باندھ شروع ہوئی۔ تو ایک بوڑھے مسٹھر نے کہا کہ گھر میں صرف ایک پھٹی پرانی ساڑی ہے، اسے ہی باری باری پہن کر مسٹر ھنیاں گاؤں کو آتی ہیں۔ اپنی جھونپڑیوں کے اندر مسٹھر ٹولی میں سب ننگی رہتی ہیں۔ اپنے کام سے نکلتی ہیں تو اٹنگ سی پتلی باندھ کر نکلتی ہیں۔

سوئے ہوئے سوچ کے پپوٹے کھلنے لگے۔ میں نے پھر اسے تھپک کر سلانا چاہا۔ میں نے خوب سیریں شروع کیں۔ ورزش بھی کرنے لگا۔ اور بندوق لے کر میلوں میں شکار کے لئے جنگل کی طرف نکل جاتا۔ شام، شام کو تھکا ماندہ آتا۔ اور بے ہوش ہو کر سو رہتا۔ میں خوش تھا کہ زندگی چین سے گزر رہی ہے۔ بارے کبھی تو آرام ملا۔

ایک سہ پہر کو میں ہریل کے شکار کے لئے سرگرداں پھر رہا تھا۔ جیٹھ کے دن تھے۔ ربیع کی فصلیں کٹ چکی تھیں۔ کھیت سنسان تھے۔ دھرتی غلے جن کر ہانپ رہی تھی۔ پیپل اور بڑ کے تناور درختوں میں نئے نئے ہرے ہرے پتے تھپیڑیاں بجا بجا کر تھکی ہوئی پیاسی نگاہوں کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں نہال ہو رہی تھیں۔ میں ایک پیپل کے پیڑ تلے دم لینے کے لئے رکا۔ پیڑوں پر

پنکھ پکھیرو خوب چیں چاں کر رہے تھے۔ بھوری مینائیں، سبز طوطے، کالے کوّے، کھیتوں میں اب دانہ دنکا تک نہ رہا تھا۔ یہ پرندے بڑ اور پیپل کے پکھوں پر گزارہ کر رہے تھے۔ ہرے ہرے ہریل بھی دبکے دبکائے پکھے کُتر کُتر کر کھا رہے تھے۔

میں تھکا ہوا تھا۔ آنکھ لگ گئی۔ اچانک شور و غل سن کر میری نیند اُچاٹ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ننگ دھڑنگ بچوں، لڑکوں اور فرسودہ حال گندی عورتوں کا ٹھٹ درختوں کے نیچے لگا ہوا ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ یہ لوگ ڈھیلے مار مار کر درختو سے پکھے گراتے اور انھیں چھین جھپٹ کر کھاتے جاتے تھے۔ ان زار و زبوں آدمیوں کے کئی گلّے اس چراگاہ کی طرف آنکلے تھے۔ ان کے بھوکے، دھنسے ہوئے پیٹ گرسنہ نظریں، ترسے ہوئے منہ۔ نارسا ہاتھ۔ عجیب بہیمانہ انداز میں پکھوں کی طرف متوجہ تھے۔ آپس میں خوب قیں قاں اور گالی گلوچ ہو رہی، پرندے اڑ اڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف جاتے۔ مگر ہر پیڑ کے گرد انسانوں کا ٹڈی دل آدھمکا تھا۔ پنکھ پکھیرو کہاں جائیں۔ خوب خوب چیں چاں ہو رہی تھی آدمیوں اور پرندوں کی جنگ! سینکڑوں آدمی اور ہزاروں پرندے تھے۔ غنا کے لئے یودھ برپا تھا۔ میں ششدر ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ تنگ آ کر پرندوں نے بہت شور مچایا۔ مینائیں تھرتھرا کر شاخوں اور پتوں میں الجھ الجھ کر ڈانوا ڈول ہوتی رہیں۔ طوطوں نے سُرخ سُرخ انگاروں جیسے دیدے نکالے، اپنے آنکس نما چونچ کھول کر حملے کئے۔ جھکے اور آدمیوں کے اوپر منڈلا کر رہ گئے مگر شوخ کالے کوّوں نے حلقے کے کنارے حملہ آوروں کے سروں پر ٹھونگیں مارنی شروع کیں۔

کال منہ کھولے کھڑا تھا۔ یورپ دیس کو روندتا، سکھاتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اب وہ یہاں آ پہنچا تھا۔ یہ فاقہ زدہ مرد اور مزدور، جیٹھ کے نٹھالے

زمانے میں نہ مزدوری کا کوئی کام ملتا تھا اور نہ قرض۔ غلّہ سیاہ نہاں خانوں میں روپوش تھا۔ بازار میں صرف اونچی قیمتیں تھیں۔ غلّہ نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اونچ نیچ کے کارن جیون کے کوکھ میں درد اٹھا۔ دھوکے کے پاؤں پڑے اور زندگی تلملا اٹھی۔ بھیانک خواب کی طرح۔ حقیقت میں آدمی اور پرندے کی جنگ جاری تھی۔ میرے دماغ میں پھر خیال کا ناوک سنسنایا۔ الٰہی پناہ! ذہن کی کالی گہرائیوں سے ایک دھندلکا ابھرا ——— میں بڑبڑا رہا تھا ——— جنگل! جنگل! ——— اور میں سوچنے لگا۔ اس جنگل سے نکلنے کا راستہ؟

———✣———

ساحر لدھیانوی

کلکتّے کے

بازاروں میں

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟
کہ ان پہ دیس کی چنتا سسک سسک کے مرے!
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا؟
کہ نسلِ آدمؑ و حوّا بلک بلک کے مرے

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں؟
کہ دُخترانِ وطن تار تار کو ترسیں!
چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا؟
کہ اُس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں!

زمیں کی قوّتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظموں، سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ، فسردہ، گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

خموش ہونٹوں سے، دم توڑتی نگاہوں سے
بشر، بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

مرزا ادیب

کنگال دیس میں

کنگال دیس میں اس دن ایک شاندار جشن برپا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ایسا جشن انھوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور بعض تجربہ کار بوڑھوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ اس دیس کی پچھلی سو سالہ تاریخ اس جشن کی مثال پیش نہیں کر سکتی بہر حال اس جشن کے لئے بہت وسیع پیمانے پر تیاریاں کی گئی تھیں۔ تمام کا تمام ملک آراستہ و پیراستہ تھا۔ کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی تھی جسے سجانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ ہر ہر گلی، ہر ہر کوچے اور ہر ہر بازار میں رنگ برنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں، خوشی کے نغمے گونج رہے تھے اور شادمانی کا ایک طوفان برپا تھا اور یہ سب کچھ تھا ایک عظیم الشان فتح کی خوشی میں۔ اس دن دشمن کی فوجوں نے ہر طرف سے مجبور ہو کر مکمل شکست تسلیم کر لی تھی۔ مکمل شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اس عدیم النظیر فتح کی خوشی میں جو کچھ بھی کیا جاتا کم تھا۔ جس طرح بھی خوشی منائی جاتی جائز تھی۔ یہ فتح کنگال دیس کی اپنی فتح نہیں تھی۔ یہ فتح تھی ان لوگوں کی جو کنگال دیس پر حکمراں تھے۔ اور چونکہ غلام اپنے آقا کی خوشی اور غم کو اپنی خوشی اور غم سمجھتا ہے۔ اس لئے بھوکے ننگے لوگ اپنے حکمران کی فتح کو اپنی فتح ہی سمجھتے تھے!

بنگال دیس بہت لمبا چوڑا دیس تھا۔ جہاں بھوکے ننگے لوگ بے شمار

گروہوں میں تقسیم ہو کر زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اور ایک ہی ہڈی کو چچوڑنے والے کتوں کی طرح ہر وقت آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اس لئے فرض شناس اور انسانیت پرست آقاؤں کے ان تمام گروہوں کی حفاظت کا ذمہ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً کنگال دیس کے مختلف گروہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں کٹ کر مر جاتے۔

کنگال دیس کے رہنے والے بالکل کنگال تھے۔ مگر تھے بڑے احسان شناس۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آقاؤں کی مہربانی کے صلے میں اپنے دیس کی ہر نعمت ان کے حوالے کر دی تھی۔ اور ان کی فتح کو اپنی فتح سمجھ کر ایک عظیم الشان جشن منا رہے تھے۔ انھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر چندہ دیا تھا۔ تاکہ جشن زیادہ سے زیادہ شاندار ہو۔ اور حقیقت یہ ہے ایسا جشن لوگوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا!

اس دن لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر بازاروں میں، کوچوں میں سڑکوں پہ گھوم رہے تھے (جوق در جوق آ رہے تھے۔ جوق در جوق جا رہے تھے) انسانوں کے اس سیلابِ عظیم سے دیس کا کوئی گوشہ بھی محروم نہیں تھا۔ دکانیں سجائی گئی تھیں۔ چیزیں خریدی جا رہی تھیں! اور چپہ چپہ سے ہر طرف ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کنگال دیس کے باشندوں کے لئے یہ پہلا میلہ تھا۔ جس میں وہ فرقہ وارانہ جذبات سے بے نیاز ہو کر سب کے سب پوری طرح حصّہ لے رہے تھے۔ پھر اس بیچارے کا کیا قصور تھا کہ وہ اس "میلے" میں شامل نہ ہوتا۔ اپنے دیس نواسیوں کی طرح وہ بھی صبح سے سجی سجائی سڑکوں پہ گھوم رہا تھا۔ جشن میں شریک ہونے کے لئے فتح کی خوشی منانے کے لئے! جہاں کہیں وہ چند آدمیوں کو لڑائی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے دیکھتا۔ کچھ دیر کے لئے ضرور ان کے پاس کھڑے ہو کر

باتیں سنتا۔ اسے ان باتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان باتوں میں عنقریب آنے والے خوشگوار دور کا ذکر ہوتا جب کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں سستی ہو جائیں گی۔ جب وہ اور اس کا کنبہ ننگا بھوکا نہیں رہے گا! لڑائی کے دنوں میں چیزیں بیحد مہنگی ہو گئی تھیں۔ صبح سے لے کر شام تک مسلسل کام کرنے کے باوجود وہ اپنا اور خاندان کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا۔ دال روٹی مہیا کرنے کے لئے اس نے اپنی صحت کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اپنا سب کچھ بیچ دیا تھا۔ لیکن بے سود۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ لڑائی سے پہلے وہ دکانداروں سے ضرورت کی چیزیں ادھار لے لیتا تھا۔ لیکن اب راشننگ کے طفیل جنس خریدنے کے لئے نقدی کی ضرورت تھی۔ اور نقدی کا یہ مسئلہ اسے رات دن پریشان کرتا رہتا تھا تاہم اس دن فتح کی خوشی میں وہ سب کچھ بھول چکا تھا، اپنی غریبی، تنگدستی اور بیمار بچی کو بھی۔ اس کی بیمار بچی دائم المرض ماں کی چھاتیاں سوکھ جانے کی وجہ سے روز بروز کمزور اور نحیف و نزار ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی مالی حالت اس قابل ہرگز نہیں تھی کہ وہ بچی کو زندہ رکھنے کے لئے بازار سے سیر سوا سیر دودھ روزانہ خرید لے!

اپنے تمام دکھوں، تمام غموں کو بھول کر وہ انسانوں کے اس بے پناہ سیلاب میں بہا چلا جا رہا تھا۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ کبھی کسی تنگ راہ میں اور کبھی کسی فراخ اور چمکتی ہوئی سڑک پر۔

سارے کا سارا ملک دلھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اور وہ مکانوں کے اوپر لہراتے ہوئے رنگین جھنڈوں کو دیکھتا ہوا، ہجوم سے گزرتا ہوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اس دن فتح کی خوشی میں ہوٹلوں کو خاص طور سے سجایا گیا تھا۔ جہاں آقاؤں کی خدمت میں قیمتی سے قیمتی شراب مفت پیش کی جا رہی تھی۔ یہ گویا اظہار تھا

اس مسرت کا جس میں آقا اور غلام دونوں شامل تھے۔ دونوں پُرخلوص تعاون کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ شمپین، کیک اور پیسٹری سے بھرے ہوئے پلیٹوں والے بھی ہنس رہے تھے، اور کنگال دیس کے بھوک سے نڈھال باشندے بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ اس لئے ہنس رہے تھے کہ قہقہوں پر قہقہے لگانا انھیں ہر طرح زیبا تھا اور یہ اس لئے ہنس رہے تھے کیونکہ ان کے آقا ہنس رہے تھے۔ اور اگرچہ وہ ہنس نہیں رہا تھا۔ تاہم اس دن وہ غمگین بھی نہیں تھا۔ جا بجا کھیل تماشے قدم قدم پر تفریح کا سامان! ایسے ماحول میں بھلا کون غمگین ہو سکتا ہے۔ بھلا کون اپنی تنگدستی اور فاقہ کشی کا خیال کر سکتا ہے؟ اور چلتے چلتے اب وہ شہر کے اس حصّے میں پہنچ گیا۔ جہاں دولتمند آدمی رہتے تھے۔ اور جو آرائش و زیبائش کے لحاظ سے شہر کا ممتاز ترین حصّہ تھا۔ وہاں کوئی بھی ایسی بلڈنگ نہیں تھی۔ جس کی پیشانی پر بڑے بڑے رنگین پرچم نہ لہرا رہے ہوں! یہ جھنڈے فاتح حکومت کی عظمت و سطوت کے نشان تھے۔ جنھیں کنگال دیس کے رہنے والوں نے اپنا خوں بہا بہا کر بلند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک شاندار ہوٹل سے نفیس و لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل رہی تھی۔ اپنی زندگی میں اس نے ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ اور آج اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ ہوٹل کے اندر جا کر خوب پیٹ بھر کھائے اس نے سنا تھا کہ فتح کی خوشی میں کھانا مفت تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور اسے بے اختیاری کے عالم میں خود بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ یکایک اسے اپنی ٹانگ میں سخت درد محسوس ہوا۔ اور وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ فاتح قوم کی ایک عورت حقارت انگیز نگاہوں

سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا سفید رنگ کا کتا اس کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا
اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ پیشانی پہ پسینے کے قطرے امنڈ پڑے۔ اور دماغ
میں زہر آلود دھواں پھیلنے لگا۔ غم و غصّے سے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا
اس کا پاؤں اٹھا۔ اور دوسرے لمحے میں کتا بلبلانے لگا۔ فضا میں ایک ہنگامہ
برپا ہو گیا۔ وزنی مکّوں اور ٹھوکروں سے اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں اور
کچھ دیر کے بعد وہ ادھموا ہو کر سڑک کے اوپر پڑا تھا۔ اس کے جسم کے ہر حصّے
میں ایک ساتھ کی نشتر چبھ رہی تھی۔ رگ رگ، ریشے ریشے میں درد ہو رہا تھا۔ اور
کمزوری کا یہ عالم کہ اٹھ کر بیٹھنا بھی اس کے لئے ناممکن تھا۔ کافی وقت گزر گیا
وہ پٹڑی پر سے رینگتا ہوا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔ اور نیم بے ہوش ہو کر لیٹ گیا
ایک دو گھنٹوں کے بعد کہیں جا کر اس نے آنکھ کھولی۔ اس کے سر کے عین اوپر
ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ بانس کو توڑ ڈالے۔ اور جھنڈے کو پھاڑ
پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اسی لمحے فوجی بینڈ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی
وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا چاروں طرف
روشنی پھیلی ہوئی تھی! اتنی روشنی اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اور معاً اسے یاد
آ گیا کہ اس کی بیمار بچی کے سرہانے مٹی کے دیئے کے تیل کو ختم ہوئے دو دن
ہو چکے ہیں۔ کل گھر میں موم بتی جلائی گئی تھی ـــــ اور آج رات کیا ہو گا؟ کہاں سے
تیل آئے گا؟ دیا کیونکر جلے گا؟

بچّی کا خیال آتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ اور گھر کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ جس
وقت اس نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یک لخت قبرستان میں
پہنچ گیا ہے۔ نئی مایوسیوں کا سامنا کرنے کے لئے۔ وہ اپنا درد بھول گیا۔ چولھے
کے اوپر ایک چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ اور اس کے پاس اس کی بیوی سر

جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور بیوی نے سر اٹھا کر اس کی طرف حسرت زدہ نگاہوں سے نہ معلوم اس سے کیا کہہ دیا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ بیوی کے ہونٹ تھرتھرائے ـــــ تھرتھرائے اور بجائے آواز کے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر پچکے ہوئے گالوں پر لپسرے ہوئے ہونٹوں کی نمی میں جذب ہو گئے۔ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ اس نے چولھے سے موم بتی اٹھائی۔ کوٹھڑی کے اندر گیا۔ بچی کے چہرے سے کپڑا اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی انگلیاں سرد، خون سے محروم پیشانی کو چھوئیں اور پھر وہ اسی طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بے جان چہرہ پر کپڑا ڈال کر باہر آ گیا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہیں بیوی کی نگاہوں سے ملیں۔ بیوی نے اس مرتبہ بھی کچھ نہ کہا۔ مگر وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ دو چار برتنوں کے سوا گھر میں اور کچھ بھی نہ تھا۔ وہ برتنوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ بیوی کی ہچکیاں اس کے سینے میں خراش ڈالنے لگیں۔ اسی لمحے فوجی بینڈ کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی رنگ برنگ کے جھنڈے اس کے دماغ میں لہرانے لگے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ گھر سے باہر نکلا اور اس باغ کی طرف جانے لگا جہاں درد و کرب کی شدت میں گھاس پر لیٹے لیٹے اس نے کئی گھنٹے گزار دیئے تھے اس وقت باغ کے ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ باغ کے اندر پہنچا۔ جھنڈے کو دیکھا اور اسے تہہ کرنے کے بعد بغل میں دبا کر باہر نکل آیا۔

ہنگامہ لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ قہقہے فوجی بینڈ اور فتح کی خوشی میں نعرے لیکن وہ اس وقت ہر چیز، ہر ہنگامے سے یکسر بے نیاز چلا جا رہا تھا۔ مردہ بچی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ اس کا منہ اب بھی کھلا تھا۔ دودھ کے لئے ـــــ دودھ کے چند قطروں کے لئے۔

وہ گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندھیرا گھپ اندھیرا تھا۔ موم بتی دم توڑ چکی تھی ـــــ اس گھپ اندھیرے میں ہچکیوں کی آواز کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ انھی ہچکیوں میں اس کی بچّی کا نام گونجا ـــــ یہ اس کے بیٹے کی آواز تھی جس کے پہلو میں اس کی بچی عموماً سویا کرتی تھی۔ اور جس نے اس رات بہن کو موجود نہ پا کر اسے آواز دی تھی۔

اس کے سینے پر ایک گھونسا لگا۔ اس نے گھر کے اندر قدم رکھ دیا یکایک اسے اپنے کندھوں پر بوجھ محسوس ہوا! اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دو سپاہی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"چور بدمعاش!" ایک سپاہی نے گرج کر کہا۔ اور اس کا ہاتھ جھنڈے کی طرف بڑھنے لگا۔

"نہیں میں چور نہیں ہوں۔ میری بچّی مر گئی ہے۔ اس کے لئے" ـــــ مگر وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کے ہاتھوں کو ایک سخت اور ٹھنڈی چیز لگی۔ اور اس کی رگ رگ میں غم اور غصّے کا آتشیں طوفان برپا ہو گیا۔

—+—

اختر انصاری

کلکتّہ

نازنینوں کا یہ نازِ دل فریب
دردمندوں کا مداوا ہی سہی
جگمگاتی شاہراہوں کا یہ نُور
تیرہ بختوں کا اُجالا ہی سہی
یہ تماشا گاہوں کی رنگینیاں
نا امیدوں کا سہارا ہی سہی
یہ طرب خانوں کی دُنیائے نشاط
قحط کے ماروں کی دُنیا ہی سہی

دل کی حیرانی کو ہمدم! کیا کروں
اپنی نادانی کو ہمدم! کیا کروں

ریوتی سرن شرما

دراڑیں

بنگال کے تقریباً تمام علاقوں میں سمندر، جھیل یا دریاؤں کی سرمئی لہریں فضا میں گدگدی کے ایک دائمی عالم کو تازہ رکھتی ہیں جس کی تاب نہ لاکر شام کا پہلا ستارہ افق پر لہروں سے اُچھل پڑتا ہے۔ اس وقت نوجوان چاند اپنی چاندی کو نیلی لہروں میں گھلانے لگتا ہے۔ آم کے کنجوں میں چکور کوک اٹھتا ہے۔ ناریل کے پیڑ اپنے پنکھوں سمیت آسمان کے جھلمل نیم نقرئی پس منظر پہ طاؤسوں کی طرح جھومنے لگتے ہیں۔ پانی کے درمیان جزیروں پر اُگے ہوئے کتھے کے پھولوں کی مست تیکھی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے! اس وقت لہروں کی کلکلاہٹ اس خوشبو سے لدی ہوئی مخمور دائرے بناتی ہوئی معصوم بنگالی لڑکیوں کی نقرئی ہنسی میں جا ملتی ہے۔ جو آم کے کنجوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ رات کا حسن سلونا اور اس کا گیت جوان ہوتا جاتا ہے۔ لہروں کا شور پرسکون اور خاموش ہونے لگتا ہے۔ نغمگی کا احساس فضا میں گہرا اور بوجھل ہو جاتا ہے۔ ستاروں کی لو دمکنے لگتی ہے —— اس وقت بنگال کے ہر ایک گھر سے دوشیزائیں دیپک کو ساری کے آنچل میں چھپائے نکلتی ہیں۔ اور اس کو صحن میں تلسی کے جھرمٹوں میں رکھ دیتی ہیں۔ گھر کے تمام افراد چاندنی میں دھلے ہوئے فرش پر جمع ہو جاتے ہیں۔ بانسری کی لے انگڑائی لیتی ہے اور "رابندر سنگیت" فضا میں گونجنے لگتا ہے۔ اس وقت آسمان کے نیلے تناؤ میں ایک

خاص قسم کی لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک لطیف بوجھ سا طاری ہو جاتا ہے ——
وہی لطیف گداز بوجھ جو دوشیزہ کے سینے پر لرز کر اس کی چال کو لوچوں میں سمو کر
رکھ دیتا ہے۔ تلسی کی سبز اوڑھنی میں دیپک کامنی کی طرح شرماتا رہتا ہے ——
لہروں کا سُرور۔ آم کے کنجوں کا سلونا پن۔ کتھے کی تیکھی خوشبو۔ تاروں کی پرنور شدید
دھڑکنیں —— بنگال کی سرزمین اسی لطیف ماحول کی حامل ہے۔

دن کے وقت سورج کی تیز کرنیں کتھے کی خوشبو کو زیادہ شدید کر دیتی ہیں
جھیلوں میں لہر اُچھلتی ہیں۔ کتھے کی خوشبو اور جھیل کی لہریں ایک دوسرے کا تعاقب
کرتی کنارے کو چھو لیتی ہیں —— پھر یہ معصوم دوڑ۔ یہ لطیف تعاقب کنارے کے
دھان کے کھیتوں میں سما جاتا ہے۔ اور دھان کے کھیت سبز شاداب بادلوں کی طرح
ایک دوسرے پر امنڈنے لگتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والی دوشیزاؤں کے رنگین
آنچل رقیق قوس قزح کی طرح لہرا کر امڈن اور سبز لہراہٹ کو زیادہ شدید کر دیتے
ہیں۔ اور آخر دھان کے یہ سبز بادل ایک دوسرے پر امنڈتے اور ڈھکیلتی ہوئی
اُفق پر نڈھال جا گرتے ہیں۔ مگر ہوا کے سبک جھونکے اس سبز رقص کو آسمان پر
اڑا لے جاتے ہیں۔ بگلوں کے پیروں کے چپوؤں سے یہ رقص تمام آسمان پر
بکھر جاتا ہے۔ اور نصف النہار کو چھو کر یہ حرارت یہ رقص ڈھلتا ڈھلتا اُفق پر انھیں
لہروں میں آ ملتا ہے۔ جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ یہ دائرے نما دوڑ۔ یہ لطیف
سبز بادلوں کی امنڈاور یہ سُرمئی حرارت جھیلوں کو دھان کے کھیتوں میں۔ دھان
کے کھیتوں کو آسمان میں اور آسمان کو لہروں میں گھول کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سبز فضائی
رقص بنگال کی فضا میں ہم آہنگی کا عالم پیدا کر دیتا ہے ——

اور بنگال میں سیلاب آیا۔ علاقے پانی میں ڈوبتے چلے گئے۔ آبادیاں طغیانی
کے بطن میں ڈوبتی چلی گئیں۔ ہر طرف ایک پُرخوف خاموشی اور مہیب ویرانی کی کیفیت

طاری ہو چلی تھی! انسان طغیانی میں بہتے ہوئے اپنی زندگی کے سہاروں کو دیکھتے اور ایک تھکی آہ کے کندھوں پر یہ الفاظ آتے۔ جو اس کی "اچھا" جو اس کی "رضا" مگر اب اس کی "اچھا" تو آج تانڈو نرت کی تانوں پر تھی.....

——— وقت زخموں کو بھر دے گا ——— مگر وقت کے ساتھ نئے زخم بھی پیدا ہوتے ہیں۔

سیلاب اترنے لگا ——— مگر کال کے آثار افق پر جھانکنے لگے تھے

آخر سیلاب اتر گیا۔ سورج آگ برسانے لگا۔ زمین تری اگلنے لگی۔ علاقے خشک ہونے لگے۔ اور زمین کے ہونٹوں پر کانپ کی موٹی پپڑیاں جمنے لگیں۔ یہ کانپ کی موٹی تہ ایک خاکی کفن تھا۔ خشک و خستہ جو بنگال کو بخشا گیا تھا۔ اور اس کفن کے نیچے دھان کے پودے سڑ رہے تھے۔ دھان کے پودوں نے سڑ کر۔ سورج کی کرنوں نے برس کر زمین کے سینہ کو تڑخ دیا۔ زمین کے سینے پر اَن گنت دراڑیں نمودار ہو گئیں۔ ایک بھیانک جال بنگال کے سینے پر بچھا دیا گیا وہ دراڑیں بہت باریک تھیں۔ افعی جاں گداز کی زبانوں کی طرح۔ مگر ان دراڑوں کی شدید تنگی پر کتنا گہرا طنز تھا۔ انسان، اس کی تہذیب، اس کا اخلاق، اس کا حُسن اور سب کچھ ان دراڑوں میں سما جائے گا۔

سب کچھ سوکھ گیا تھا ——— طغیانی کا اوڑتا پانی۔ پانی سے اُبلتی جھیلیں سیلاب سے ابھرے دریا۔ دریاؤں میں ڈوبے کھیت۔ قدرت اور سائنس کے معمولی بخاراتی اصول کے مطابق پانی کا قطرہ قطرہ بخارات میں تبدیل ہو رہا تھا مگر بنگال کے ہر مرد و زن کی آنکھوں میں آنسو کا ایک ایک قطرہ ابھر رہا تھا ——— گول مدوّر لرزاں آنسو ——— جب ہونٹوں پر پپڑیاں جمتی ہیں۔ تو آنکھوں میں بھی آنسو ابھرتا ہے۔

یہ آنسوؤں کا قطرہ ـــــ کاش سائنس کا کوئی اصول۔ حرارت کا کوئی نقطہ ایسا معلوم کیا جا سکتا۔ جو اس قطرے کو بخارات میں تبدیل کر سکے۔ چوس کر جذب کر ڈالے۔ یہ قطرہ ابھی تک شاہد ہے کہ انسان ایک "نفس مجبور" ہے۔ خدا اپنی ذات کو اسی قطرے کے پار محفوظ کئے بیٹھا ہے۔ ہاں اس کا عکس کبھی کبھی اس قطرے کی شفاف اور مدوّر سطح پر جھلکنے لگتا ہے۔ گرمی پڑتی ہے۔ بنگال کی کھاڑی سے بخارات اٹھتے ہیں۔ راستے میں ہمالیہ پہاڑ آجاتے ہیں۔ بخارات برس پڑتے ہیں۔ بھوکل گستی ہے۔ آہ و بکا کے بخارات بلند ہوتے ہیں۔ کونسلوں۔ نفع خوروں۔ ہندو مسلم نفاق اور جنگ کے ہمالیہ راستے میں آجاتے ہیں۔ آنسوں برس پڑتے ہیں ـــ بنگال کے آنسوؤں سے بکھرتی قوس قزح اپنے رنگ دکھانے لگی۔

روح کو پیٹ سے محبت ہے۔ تاجر نے جوان لڑکی کو تیس روپے میں خرید لیا۔ ماں روپے لے کر عجلت سے بنیئے کی دوکان کی طرف دوڑی۔ بنیئے کی دوکان خالی ہے۔ ماں کے بھوکے پیٹ کی طرح۔ مگر اس کی دوکان کی ہر بنیاد کے نیچے چاولوں کے بورے ہیں۔ چاولوں سے بھرا ہوا بورا بنگالی ماں کے بھر جانے والے پیٹ کی طرح۔ بنیئے کی تھیلی اور بھر گئی۔ بنیا چاول نہیں بیچتا۔ وہ دوشیزاؤں کا حسن بیچتا ہے۔ عورت کا گوشت فانی ہے۔ اور چاندی کے سکّے غیر فانی..... انسان ابد تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کو غیر فانی چیز کی ضرورت ہے۔ انسان اس طرح اپنی بنیادیں مضبوط کر رہا ہے۔

"ماں..... او ماں..... اری ماں"۔

بچّہ بلک رہا ہے۔ ماں دوڑ رہی ہے۔

"او ماں۔"

ماں نے سُنا۔ مگر وہ بے تحاشا دوڑی جا رہی ہے۔ محبّت ایک بوجھ ہے۔

زندگی ایک دوڑ ہے۔ رفتار اس کی شرط ہے۔ روٹی اس کی حیات ہے۔ اور وہاں روٹیاں بٹ رہی ہیں۔ ماں زندگی کی شرائط پوری کر رہی ہے۔ وہ جا رہی تھی۔ اس نے دیکھا۔ سڑک کے کنارے پر روٹیاں بٹ رہی ہیں۔ بھوکے جمع ہیں۔ وہ دوڑی۔ مگر بچّے کو بغل میں لے کر وہ دوڑ نہیں سکتی۔ اور روٹیاں ختم ہو جائیں گی۔ ختم ہو رہی ہیں..... روٹیاں ختم ہو گئیں۔ اس لئے بچے کو پٹک دیا۔ اور دوڑی۔

اُری ماں..... چُوں چپٹ چُنخ..... س..... چ۔ "ریلیف کیمپ کی گاڑی بچّہ کو کچلتی چلی گئی، ہُر کی نہیں۔ اس کے پیتے گنگناتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ زندگی ایک دوڑ ہے۔ رفتار اس کی شرط ہے۔ رفتار اس کی شرط ہے۔

آہ..... ماں..... ں ——— روح آزاد ہو گئی۔

ماں روٹی کھا رہی تھی۔

ہندوستانی فلسفی ہیں۔ جبھی تو انھوں نے اپنا نیا خُدا پتھر کا بنایا ہے۔ اور زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔

چورنگی پر انسانیت اپنی عُریانی، بے بسی۔ بے حیائی۔ بیماری اور دریوزہ گری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دال بھات تقسیم ہو رہا تھا۔ مرد سے چلّا رہے تھے۔ ہم بھوکے ہیں۔ "بھات بابا" ——— "او بابا" عورتیں اپنے نیم عریاں اعضا کو عُریاں کر کے چلّا رہی تھیں۔ "روٹی..... روٹی" ——— گویا ان کے اعضا۔ ان کی عصمت نمائش کی "عجیب و غریب اشیاء تھیں ——— آؤ ——— اندر آ کر دیکھو۔ ایک روٹی میں۔ ایک مٹھی چاول میں۔ وہ جو تمہاری آنکھوں نے سورج کی روشنی میں برہنہ نہ دیکھا ہو۔ آؤ ایک روٹی میں۔ عصمت ایک کاسہ ہے۔ انسان ایک فقیر ہے۔ روٹی اس کی حیات ہے۔ اور روٹی ناپید ہے۔

"ریلیف کیمپ" کے کرم چاری فقیروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ

مصوّر بھی انھیں فقیروں میں پڑا تھا۔ "اُلّے ہٹّا کٹّا یہاں پڑا ہے؟ نوکری کیوں نہیں کرتا۔ حرامی۔" انسان کے انسانی فرشتے اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ مصوّر کی نگاہوں میں تاریکی۔ کے بگولے چکرانے لگے۔ روٹی کے لئے نوکری کرلوں..... تو کیا روٹی زمین سے پیدا نہیں ہوتی؟ کیا گنگا جمنا کے وسیع میدان بنجر ہو گئے ہیں؟ کیا انسانی خون ہی ان میدانوں کو سیراب کرے گا؟ کیا ہم از سر نو آدم خور ہو گئے؟ ——

ایک شدید درد سے وہ تڑپ اٹھا۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ اس نے بارہا صبح کے رخساروں کو ارغوانی حُسن میں شرابور ہوتے دیکھا تھا۔ محبّت کی دھیمی لَو سے تپ کر گلابی ہوا اٹھنے والے رخساروں میں رنگ بھرا تھا۔ گلاب کی گلابی پر مدہوش ہو کر بلبل کو گیت رچاتے سُنا تھا۔ وہ مئے ارغواں کے پیالے کے ساتھ چھلک پڑتا تھا۔ گلابی یہ رنگ اصلی ہے۔ ابدی ولافانی ——" اس کے قریب ایک کتّا دوسرے مُردہ کتّے کی نعش کو چیر رہا تھا۔ اس کا تخیّل آج شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی ایک کرب انگیز لہر اٹھی اور وہ قریب والی بھات نگلتی ہوئی بڑھیا پر جھپٹا

ایک ڈنڈا اس کے سر پر پڑا۔ "بدمعاش بے ایمان..... خونی۔"

"خونی..... ہا..... ہا..... ہا....." اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ صرف سر سے خون بہہ کر اس کی آنکھوں میں جمع ہو رہا تھا.....

..... ہا..... ہا..... ہا..... خونی..... میں خونی ہوں۔ مجھے گوشت چاہیئے۔ سُرخ..... سُرخ انگاروں کی طرح دہکتا ہوا..... تازہ مہکتا خون..... انسان کی ازلی وابدی خوراک۔"

زمین کے سینے کی دراڑیں بدستور مسکرا رہی تھیں۔

احمد ندیم قاسمی

ہَیضہ

[بنگال کے ویران پس منظر پر ایک نقش]

سنسناتا ہوا اک تیر چلا،
گنگنانے لگی پنہائی عرش
تارے گھبرائے، اُچھل کر ٹوٹے
تیر کی منزلِ مقصود تھی فرش

سرسراتی ہوئی تاریکی میں
اک دمکتی ہوئی ڈوری بُنتا
چیرتا آیا خلاؤں کے جگر
اور ہواؤں کے کلیجے دُھنتا

وہ قریب آیا، وہ ٹھٹکا، وہ رُکا
وہ تڑپنے لگا افعی کی طرح،
وہ تڑپتے ہوئے پلٹا، لپکا
تیز کوندے کی بجلی کی طرح،

تیرا انداز نے آنکھیں مل کر
تیر کو دیکھ کے اک آہ بھری
ایک سیّارے پہ ترکش پھینکا
اور کماں توڑ کے شانے پہ دھری

تیر سے گوشیاں کرتا آیا
"تو نے کیا ظلم کیا تھا آقا!
کیا ضرورت تھی نئے تیروں کی
واپس آ لے مرا ہمدم — قاقہ"

ریاض رؤفی

زندگی کی ایک شام

وہ پریشان تھی ——

ضروریاتِ زندگی کا تو ذکر ہی کیا، عیش و نشاط کے تمام سامانوں کے باوجود وہ پریشان تھی۔ کمرے کی آرائش مشرقی و مغربی تہذیب کے امتزاج کا ایک دلفریب نمونہ تھی۔ سادہ سے نازک لوہے کے پلنگ پر ہلکے نیلے رنگ کی پھول دار مچھر دانی تنی ہوئی تھی، جو اس وقت اوپر اٹھا دی گئی تھی۔ نرم نرم گدوں پر جاپانی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ پائینتی پر ایک ایرانی خوش رنگ موٹا کمبل رکھا تھا۔ دودھ کی طرح سفید تکیے پڑے ہوئے تھے جن کی جھالر نیلے رنگ کی تھی۔ اُس نے ایک ہلکے نیلے رنگ کا گرم چینی گون پہن رکھا تھا۔ جس کا ریشمی تاگوں سے گتھے ہوئے، رنگین بیلیٹ کا پھندنا ایک طرف لٹک رہا تھا۔ گون کی پشت پر خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے۔ اس کی آستینوں پر رنگین بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ تکیوں کے قریب ہی ایک گتھے ہوئے رومال پر ایک کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی —— اور اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر تکیوں میں گاڑھ رکھا تھا —— وہ پریشان تھی۔

اُسے کیا خبر تھی کہ میز کے اوپر سُنہری فریم میں مقید، دیوار پر لٹکی ہوئی، شارلے ٹمپل اُس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے دانت چمک رہے ہیں۔

اور ہنسی، شیشے کی قید کو توڑ کر باہر نکلی پڑتی ہے۔ شارلے ٹمپل کے داہنے جانب نارما شیرر اور بائیں جانب سیاہ گیسو والی، ڈال رس ڈی ریو کی تصویر تھی۔ جو اپنی نگاہوں میں یاس و حسرت کا خزانہ لئے کسی کی محو انتظار تھی۔ نارما شیرر حزن و ملال کی مجسّم جیولٹ بنی ہوئی تھی ——— کمرے کی فضا درد و غم، یاس و مسّرت سے پُر تھی۔ کیونکہ شاما خود پریشان تھی۔ اور شارلے ٹمپل اس افسردہ فضا کا مذاق اڑا رہی تھی۔

ایک کونے میں، فرش سے کوئی دو فٹ کی بلندی پر ایک جاپانی دوشیزہ کی نیم عُریاں تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حسینہ ابھی نہا کر آئی ہے۔ اور آرام کرسی پر بیٹھی آفتابی غسل سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا تر کی تولیہ اپنی رانوں پر ڈال رکھا تھا۔ اور مُسکرا مُسکرا کر اپنے سڈول اور صحت مند اثمار شباب کی نمائش کرا رہی تھی۔ کمرے میں چند عُریاں و نیم عُریاں تصویروں کے علاوہ چند سینریز بھی تھیں۔ تصویروں کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ مکین کے جمالیاتی ذوق میں عُریانیت کو زیادہ دخل ہے۔

ہر فلالین چڑھی ہوئی، آفس میز پہ پارکر پین، پین اسٹینڈ کی بجائے نیچے پڑا ہوا تھا۔ لیٹر پیڈ ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ پین کے پیچھے ہلکے نیلے رنگ کے بلّور کا بنا ہوا ایک عورت کا چھوٹا مجسمہ تھا۔ جو اپنے ہاتھ میں ٹائم پیس لئے ہوئے تھی۔ اُس کے بیٹھنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ اس نے اپنی داہنی ٹانگ کو پوری وسعت سے پیچھے کی طرف پھیلا رکھا تھا۔ اور بائیں ٹانگ آگے کی طرف گھٹنے سے موڑ رکھی تھی۔ گردن پیچھے کی طرف جھکی ہوئی تھی اور دراز گیسو پشت پر لہرا رہے تھے۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے جن کی کشادہ ہتھیلیوں پر گھڑی رکھی تھی۔ گھڑی نو بجے کا وقت بتا رہی تھی، اگرچہ اس وقت ڈھائی بجے تھے۔

میز پہ داہنی طرف ایک چمکدار فوٹو اسٹینڈ رکھا تھا۔ جس میں ایک خوبصورت آدمی کی تصویر تھی۔ اُس کے بال پریشان تھے اور لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اُس نے بغل میں دو ریکٹ دبا رکھے تھے۔ اور دونوں ہاتھوں میں ایک چاندی کا بڑا کپ پکڑے ہوئے تھا۔ اس تصویر کے سامنے ایک ننھا سا ہاتھی دانت کا مجسمہ تھا جس میں پانچ ہاتھی ایک دوسرے کی پیٹھ پر پیر رکھے کھڑے تھے۔

میز کے پن کوشن، پیپر ویٹ اپنی اصلی جگہ سے سرکے ہوئے تھے میز کے نیچے ردّی کی ٹوکری کے قریب ہی چند گلابی کاغذ کے مڑے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ میز کی مخالف سمت پر ایک بڑی الماری تھی، جس کے ایک پورے دروازے پہ آئینہ لگا ہوا تھا۔ الماری کے بائیں طرف ایک کپڑے ٹانگنے کا اسٹینڈ تھا جس پہ مختلف رنگ کی ساریاں، بلاؤز، تولئے تہہ کئے ہوئے رکھے تھے۔ داہنی طرف ایک بانس کا بنا ہوا ریک تھا، جس پہ تقریباً دو درجن سینڈل، پمپ شوز اور دو تین چپلوں کی جوڑیاں رکھی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باٹا کا شوکیس لاکر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔

ڈریسنگ اسٹینڈ کے قریب ہی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر قسم قسم کے تیل شیمپو کریم، پوڈر، سُرخیاں، غرض کہ سنگار کا تمام سامان قرینے سے رکھا تھا۔ میز اور پلنگ کے درمیان ایک چھوٹی الماری اور ایک چھوٹا سی کشمیری کام کی میز اور بھی تھی۔ میز پر ایک البم رکھا تھا۔ اور الماری میں کتابیں جمی ہوئی تھیں۔ ٹائمس آف انڈیا کی ہوم لبریری کی کتابیں شیشوں سے چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ پلنگ کے سرھانے ایک چھوٹی سی میز پہ ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ قریب ہی اُمرت بازار پتریکا کے اوپر "السٹریٹڈ ویکلی" لاپروائی سے ڈال دیا گیا تھا۔

ان کے علاوہ کمرے میں اور بھی بہت سا سامان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔

جو مکین کی خوش مذاقی اور نفاستِ طبع کی دلیل تھی۔ دیوار گیریوں اور آتشدان پر پیتل کے چمکتے ہوئے اونٹ، ہاتھی اور سارس قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار پر ایک طرف ایک کلاک لگا ہوا تھا جس سے جب، ہر پندرہ منٹ بعد ہلکی مترنم آواز پیدا ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دور کہیں کسی گرجے میں ارغنون بج رہا ہے۔ ایک لمبی سی میز پر غلاف چڑھے ہوئے تین ٹینس ریکٹ پریس میں دبے رکھے تھے لیکن وہ پریشان تھی۔

اس نے اپنا سر تکیوں سے اٹھایا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں تمتماتے ہوئے رخساروں پر آنسو کے قطرے گلابی شفق میں چمکتے ہوئے تارے معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے رومال کا کونا پکڑ کر کھینچ لیا۔ کتاب الٹ گئی۔ یہ وکٹوریہ کراس کا ناول LOVE IN THE STUDIO تھا۔ اس نے اپنے آنسو خشک کئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اُس کی نظر شارلے ٹمپل پر پڑی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی قہقہہ مارتی، تالیاں بجاتی، اُچھلتی کودتی اس کے سامنے آجائے گی۔ اسے سخت تکلیف ہوئی۔ اس کا دل بہت بے قرار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاید چیخ کر رونے لگے گی۔ اس نے اپنے آپ کو کرسی پر گرا لیا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر چمکدار فریم کی تصویر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اُس نے اپنا سر اپنی باہوں پر ٹیک لیا ـــــ کلاک کی مترنم آواز سے چونکی۔ فریم کو اُس کی جگہ پر رکھا۔ پین۔ پین اسٹینڈ میں رکھا۔ پن کوشن اور لیٹر پیڈ کو اُن کی جگہ پر کیا اور بستر پر آکر گر گئی۔ اس کا بایاں پیر پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس کے، گردن تک تراشیدہ بال اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا تھا۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ شاما نے اٹھ کر بیٹھتے ہی آنسو خشک کیئے اور پوچھا "کون؟"

آیا اندر آئی ——— "مسی بابا! آپ کا فون ———" شاما فوراً سمجھ گئی کہ فون پہ سوائے رمیش کے اور کون ہوگا۔ اسے معاً خیال گزرا کہ وہ کوئی بہانا بنا دے "سو رہی ہیں۔" "غسل خانے میں ہیں۔" مگر اس کی نظر ٹینس پلیئر کی طرف اٹھ گئی اور ایک لمحہ بعد وہ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔

"ہیلو! ———"

"ہیلو! تم ہو ڈارلنگ۔ ساری ٹو ڈسٹرب یو ——— مگر اس وقت تو تین بج رہے ہیں ——— کہنا صرف یہ تھا ڈیر! ——— کہ چار بجے میں کار لے کر پہنچ جاؤنگا ——— تم میرے ساتھ ہی کلب چلنا۔ آج جلدی پہنچ جانا چاہیئے ——— فائنل ہے نا ——— ہاں تو تم تیار رہو گی نا ——— اچھا ——— چیریو ڈیر ———"

اس کی ماں ایک صوفے پر بیٹھی، ریڈ کراس کے لئے اون کا ایک سوئٹر بُن رہی تھی۔ شاما دروازے تک جا کر پھر واپس ہوئی۔ اُس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا، ایک ہلکا سا غلاف چڑھا لیا۔ اُس نے ماں سے کہا ——— "ممی! آج تم بھی کلب چلو۔ فائنل میچ ہے ——— لیڈی گورنر پرائز ڈسٹریبیوٹ کریں گی ——— کلکتہ کی تمام جنٹری وہاں موجود ہوں گی۔"

"اور کھیلے گا کون؟" بڑھیا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہندوستان کا چمپین غوث محمدؐ اور امریکہ کا بہترین کھلاڑی ہیل سرفیز" "مگر مجھے تو آج شام ریڈ کراس کی میٹنگ میں جانا ہے۔ تم کلب پہنچ کر موٹر میرے لئے بھجوا دینا۔"

"مگر میں تو رمیش بابو کے ساتھ جا رہی ہوں۔ فون پر انھوں نے کہا ہے کہ

وہ چار بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

شاما اپنے کمرے میں پہنچی تو مسکراہٹ کا غلاف خود بخود گر گیا۔ اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک پلنگ پر پڑی رہی۔ سوا تین کے گھنٹوں نے اُسے ہوشیار کیا۔ اُس نے گھنٹی بجا کر آیا کو بلوایا۔ اور نہانے اور ڈریسنگ کا سامان تیار کرنے کو کہا۔ لیکن وہ خود پلنگ پر پڑی رہی۔

رمیش تو ولایت ہو آیا تھا۔ ٹھیک چار بجے اس کی کار شاما کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ موٹر سے اتر کر رمیش ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بھیا کو نمسکار کیا۔ "ارے کون! رمیش! بہت دنوں میں آئے بیٹا؟"

"کیا کروں چاچی! —— پتا جی آج کل امرتسر گئے ہوئے ہیں۔ سارا کام مجھے ہی سنبھالنا پڑتا ہے۔ کیا شاما اب تک تیار نہیں ہوئی؟"

"ارے آیا! جا بے بی سے کہدے بیرسٹر صاحب آگئے ہیں۔"

رمیش نے کریم کلر کی سرج کی قمیص اُسی رنگ کا فلالین کا پینٹ اور سُرخ وسفید چوڑی دھاری کے بلیزر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ویسے ہی وہ سُرخ وسفید اونچا، پورا، خوبصورت جوان تھا۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ اس پودے کی نسل کشمیر سے لائی گئی ہو گی۔

* * * *

وہ دونوں موٹر میں سوار ہو گئے۔ اس موٹر میں صرف دو ہی آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ شاما ایک کونے میں سمٹی ہوئی خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اپنے خیالات کی دُنیا میں گم تھی۔ وہ بھول چکی تھی کہ وہ آج ٹینس فائنل دیکھنے جا رہی ہے —— آج غوث محمد کا میچ ہے۔ اس کا پسندیدہ ہیرو جس کی سروس اور بیک ہینڈ ڈرائیو کی وہ پرستار تھی —— ٹینس ٹینس —— مگر وہ خاموش تھی —— پریشان تھی

وہ، وہ مشہور جملہ، جس کی وہ دن میں کئی مرتبہ تکرار کرتی تھی۔ بالکل بھول چکی تھی TENNIS

IS POETRY IN UCTION

موٹر شہر کے وسط سے گزر رہی تھی۔ ایک فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے قریب ایک نیم عریاں فاقہ زدہ عورت کی لاش پڑی تھی۔ جس کے چہرے پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ اس کا آدھا دھڑ فٹ پاتھ پر تھا اور پیر نیچے سڑک پر پھیلے ہوئے تھے۔ مگر وہ TENNIS IS POETRY IN ACTION تو ایسٹ انڈیا کلب جا رہے تھے۔ ٹینس میچ دیکھنے اور یہ موڈ خراب کر دینے والا منظر۔ رمیش سوچ رہا تھا۔ کیا انھیں مرنے کے لئے جگہ تنگ تھی۔ وسط شہر میں آکر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اور پھر شاہ راہ عام پر یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ آج کل کلکتے میں روزانہ ایسے منظر دیکھنے میں آتے تھے۔

رمیش سے نہ رہا گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا ——— "شاما! آخر کیا بات ہے؟ میں چند روز سے تمہیں بہت پریشان دیکھ رہا ہوں۔ ایسی کونسی بات ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر اس پریشانی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ آخر کچھ تو بتاؤ ڈیر ——— کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتیں۔ شاما! کیا مجھے تم سے یہ بھی پوچھنے کا اختیار نہیں۔ بتاؤ شاما ——— بتاؤ ڈیر ———" شاما سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر رومال نکالا اور اپنی انگلیوں پر لپیٹنے لگی۔ رمیش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ دبایا۔ شاما کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ بیقرار ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ "مائی ڈارلنگ! مائی ڈارلنگ!! مائی ڈو!!!" شاما نے اس کا ہاتھ کاندھے سے ہٹایا اور رومال سے آنسو خشک کر لئے۔ کیونکہ موٹر کلب کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ شاما نے اپنی حالت درست کی اور اس کی طرف شرمگیں نظروں سے دیکھا اس نے شاما کو سہارا دے کر موٹر سے نیچے اتار لیا۔

کلب کے باہر پولیس کا پہرہ تھا۔ سپاہیوں کو بار بار اُن چھوٹے چھوٹے عُریاں فاقہ زدہ بچّوں کو دور تک بھگانا پڑتا تھا۔ جو اُن کی غفلت میں کلب کے دروازے کے قریب آجاتے تھے۔ یہ ننگے دھڑنگے چھوٹے چھوٹے بھوکے بنگالی ایٹ ہوم کے خاتمے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

کلب کے اندر کی فضا رنگینیوں (رعنائیوں) سے معمور تھی۔ خوشبوئیں ہوا میں تحلیل ہو گئی تھیں، رنگ برنگ کی ساڑیاں۔ اونچی نیچی ایڑی کے ساریوں کے رنگ میں میچ کرتے ہوئے سینڈل۔ روئیں دار ایلسٹر۔ چوڑی دھاری دار بلیزر کے کوٹ، کالے، ہرے، اودے، ٹیلے فیلٹ، ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس مختصر سی جگہ میں جو شاید ساری کلکتہ کی زمین کا $\frac{1}{1000}$ حصہ بھی نہ تھی، سارے شہر کی رونق جمع تھی۔ "عملی شاعری" ۲۶ گز لانبے اور بارہ گز چوڑے سبز قطعے میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ عمل پیرا تھی۔ مگر اس شاعری کی پرستار شاید بھولی ہوئی تھی کہ YENNIS IS POETRY IN ACTION وہ سر جھکائے اپنے خیالات کی دُنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ سرسبز قطعہ۔ سفید سفید لکیریں۔ اودے اودے پردے اور فضا میں ایک مترنّم ارتعاش پیدا کرتی ہوئی سفید گیند ——— جنت نگاہ اور فردوس گوش ——— مگر اس کا دماغ ان باتوں کو سوچنے سے قاصر تھا۔ عملی شاعری کا سارا فضا میں نغمہ ریز رہا۔ سفید گیند ہوا میں رقصاں رہی اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی جب کسی "حسین شاٹ" پر ہر طرف واہ واکا غُل مچتا۔ تو وہ بھی گردن اٹھا کر ایک نظر دیکھ لیتی تھی۔

کھیل کے اختتام پر لیڈی گورنر نے انعامات تقسیم کئے۔ لوگ میچ پر رائے زنی کرتے ہوئے اس میدان کی طرف جانے لگے جہاں ایٹ ہوم کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید کپڑوں میں ملبوس گلدستوں سے آراستہ میزیں دور تک پھیلی

ہوئی تھیں۔ سفید پوش، رنگین پٹے کمر میں لپٹے ہوئے خانساماں پارٹی کے اہتمام میں مصروف نظر آتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان اس قدر جمع کر لیا گیا تھا کہ مہمانوں کی تین گنی تعداد اسے سیر ہو کر کھا سکتی تھی۔ مگر اعلیٰ طبقے کے نمائندے، فیشن کے دل دادہ، کھاتے کم تھے اور چھوڑتے زیادہ تھے۔ آخر کسی طرح دروازے کے باہر کھڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بھوکے بنگالیوں کا خیال رکھنا بھی تو ضروری تھا۔ آج کی پارٹی کے لئے ہر قسم کی لذیذ، خوش ذائقہ اشیاء، افراط سے فراہم کی گئی تھیں۔ بنگالی مٹھائیاں۔ کشمیری پھل، افغانستان کے میوے۔ ناگپور کے سنترے۔ فرانسیسی شراب، اور انگریزی چاکلیٹ۔ خوش سلیقہ منتظمین نے ہر مذاق کا خیال رکھا تھا۔ کیک پیسٹرز سے لے کر سوڈا تک کا انتظام تھا۔

ڈسمبر کی خنکیوں میں بھیگی ہوئی چاندنی آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے لگی تھا۔ آج کی پارٹی کے بعد رخصت ہو گئے۔ صرف کلب کے ممبر اور ان کے "مخصوص مہمان تو پارٹی کے بعد رخصت ہو گئے۔ صرف کلب کے ممبر اور ان کے "مخصوص دوست" باقی رہ گئے۔ یہ سب سگرٹ کا دھواں اڑاتے ادھر ادھر بکھر گئے اور ان کے سائے اونچی روشوں، گھنی جھاڑیوں اور تاریک گوشوں میں غائب ہو گئے رمیش دیر سے شاما کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ پارٹی کے بعد مس رضیہ کو موٹر تک چھوڑنے گئی۔ پھر لوٹ کر نہیں آئی۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہ ٹینس کورٹ کے قریب ایک بنچ پر تنہا، خاموش بیٹھی تھی۔

"ارے! میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ اور تم یہاں بیٹھی ہو؟" وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی ——— "کیا تمہیں سردی نہیں معلوم ہوتی۔ تم نے اب تک چسٹر بھی تو نہیں پہنا۔ چلو اندر ہال میں چل کر بیٹھیں"۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ جاڑے کی بھیگی ہوئی چاندنی رات اور تنہائی۔ رمیش کا جی چاہا کہ اسے آغوش میں لے کر اس کے لبوں کو چوم لے۔ مگر شاما نے اتنا موقع ہی نہ دیا، وہ قبل اس کے رمیش پیشقدمی

کرے آہستہ آہستہ کلب کی عمارت کی طرف جانے لگی۔

کلب کے ممبروں کی تعداد بہت زیادہ تو نہیں تھی۔ مگر صرف وہی لوگ اس کلب کے ممبر ہو سکتے تھے جو اپنی تفریحات کے لئے زر کثیر صرف کر سکتے ہوں۔ کلب کے ممبروں کا مذاق بھی مختلف تھا۔ کثیر تعداد صرف ٹینس کھیلنے آتی تھی، مسٹر گھوش، ڈاکٹر چکرورتی، مسٹر بنرجی صرف اخبار پڑھنے، شطرنج کھیلنے اور گپ مارنے آتے تھے کچھ لوگ صرف بلیرڈ، برج یا فلیش کھیلنے آتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو صرف شراب پینے آتے تھے۔ مسٹر اسکاٹ بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ وہ عمر رسیدہ آدمی تھے۔ ان کا سر کیرم بورڈ کی طرح چکنا تھا۔ وہ شام میں گاف کھیلنے اور صرف شراب پینے اور اخبار میں اسپورٹ کی خبریں پڑھنے کلب آجاتے تھے۔ یوں تو ہر شخص اُن سے مذاق کرتا تھا۔ مگر سہروردی سے اُن سے ایک منٹ نہ بنتی تھی۔ سہروردی کا انڈیا ٹی کمپنی میں ایک بڑا حصہ تھا۔ اور مسٹر اسکاٹ کو چائے سے سخت نفرت تھی۔ سہروردی نے آج پھر ان پر چوٹ کی ——— "سُنا! مسٹر اسکاٹ!! گورنمنٹ نے نیا قانون جاری کیا ہے۔ یہ آپ کے ——— تمام گاف کے میدانوں پر ہل چلا کر اُن پر چاول کی کاشت کی جائے گی۔" مسٹر اسکاٹ نے جھلّا کر جواب دیا ——— "گورنمنٹ کو چاہئے پہلے دارجلنگ کی چائے کے کھیتوں پر ہل چلا کر اس پر چاول کی کاشت کرے۔ گاف کھیلنا تو صحت کے لئے فائدہ مند ہے، مگر چائے سے صرف نقصان ہی ہوتا ہے۔"

——— اور پھر الیسٹ انڈیا کلب کے لانوں پر بھی تو چاول پیدا کیا جا سکتا ہے۔"

رمیش نے بھی اس گفتگو میں حصّہ لیا۔ اس کا مقصد شاما کو خوش کرنا تھا۔ مگر وہ صوفے پر خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا یہ غیر معمولی رویّہ ہر شخص کے لئے حیرت کُن تھا۔

ایک کونے میں دوسری پارٹی بیٹھی تھی۔ یہ سب تجار تھے۔ صرف شراب پینے اور گپ مارنے کلب آتے تھے۔ مسٹر بنرجی ان کے لیڈر تھے۔ وہ روز سیگاؤں اور

ٹوکیو ریڈیو کی خبریں لاکر سُنایا کرتے تھے۔ "آج بوس نے سیگاؤں ریڈیو پر کہا کہ وہ بنگالیوں کے لئے چاول لے کر آرہا ہے۔" "آج رنگون سے ہندوستان کی عارضی حکومت کا اعلان ہوگیا۔ بوس بابو اس کے صدر اور کمانڈر انچیف ہیں۔"

"جرمنی اپنے محاذ کو چھوٹا کرنے کے لئے خود پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ وہ موسم سرما کے بعد روسیوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ گورنمنٹ نے سارا اناج بنگال سے باہر بھیج دیا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر فوج میں بھرتی ہو جائیں۔" وہ ایسی ہی خبریں لاکر دوستوں کو سُنایا کرتے تھے اور یقین دلاتے کہ آج کل میں جاپانی کلکتہ پہنچ جائیں گے۔ پھر یہ تمام کساد بازاری دور ہو جائے گی۔ ان کے گروہ تو ان کی باتیں غور سے سنتے۔ مگر دوسرے خوش فکر سے ان کا خوب مذاق اڑاتے۔

"مسٹر بنرجی!" رمیش نے پوچھا۔ "کیا کہتا ہے آج کل آپ کا ریڈیو؟ روسی تو بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ کیو پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے ـــــ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ذرا سردیوں کا موسم ختم ہو جائے۔"

"مگر گزشتہ سال بھی آپ ایسے ہی کہتے تھے۔"

"مگر بار سٹر صاحب!" بنرجی نے مُنہ بنا کر کہا ـــــ کیو سے کوئی سڑک کلکتہ نہیں آتی۔ منی پور سے آتی ہے۔" اور وہ خود ہی اپنے طنز پر مُسکرائے۔

"سُنا ہے کہ انگریزوں نے جاپانیوں کو واپس ڈھکیل دیا۔" رمیش نے پھر چوٹ کی۔ "اور جنرل اسٹل ول کی فوج شمال سے بڑھ رہی ہے۔"

"اچھا ـــــ ہاں ـــــ بہت جلد معلوم ہو جائے گا" ـــــ وہ مُسکرائے۔

"اور نیو گنی پر جو امریکنوں کا قبضہ ہو گیا۔"

"مگر کلکتہ اور منی پور میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ اور راستہ بھی صاف ہے۔"

رمیش کچھ دیر اُن سے اُلجھتا رہا ـــــ "کیا خبر ہے آج کی۔ سُنا شہر میں دو سو آدمی فاقے سے مر گئے۔"

"بس!" بنرجی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آج چوکیدار سے معلوم ہوا کہ ایک نوزائیدہ بچے کی لاش کلب کے احاطے کے قریب پائی گئی" ـــــ مسٹر حسن نے کہا "کسی نے بچے کو مار کر وہاں پھینک دیا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مگر اب تک کوئی پتہ نہ چلا" ـــــ سب چوکنے ہو گئے۔ شاما بھی حیرت زدہ تھی، اب وہ اس گفتگو کو غور سے سُن رہی تھی۔

"کلب کے احاطے کے قریب؟" رمیش نے دہرایا۔

"ہاں!" مسٹر حسن نے کہا۔

"کسی پاپ کا پھل ہو گا" شریمتی شیلا دیوی نے مُسکراتے ہوئے کہا شاما کھڑی ہو گئی اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

رام رام۔ پاپ۔ پاپ۔ مہا پاپ۔" ایک کونے سے آواز آئی۔

"مَیں گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" شاما نے کھڑے ہوئے رمیش سے کہا۔ رمیش کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ وہ کلب سے نکل کر اپنی موٹر کی طرف چلے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ مگر شاما کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے رومال نکال کر پیشانی کا پسینہ خشک کیا۔ رمیش نے محسوس کیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ مگر اس وقت اس نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

کلب کے باہر انھوں نے دیکھا کہ پارٹی کے بچے کھچے سامان کو سڑک کے کنارے ایک کوڑے پر پھینک دیا گیا تھا۔ چند ننگے دھڑنگے بچے اس مالِ غنیمت پر پلے پڑتے تھے۔ وہ سب چاند کی روشنی میں کتّوں کے پلّے نظر آتے تھے راستے میں ایک جگہ بھوکوں کا جمِ غفیر نظر آیا! انھیں لائن سے بٹھا دیا گیا تھا۔ اور کچھ

رو مولادت جو چھ ماہ دار جلنگ میں رہیں، تمہیں خبر ہے وہ وہاں کیا کرتی رہیں؟
ارے یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ معمولی باتیں ہیں یہ۔ میں تمہیں بہت سی مثالیں بتا سکتا ہوں۔ ہم لوگ ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ چلو اٹھو! چھوڑو یہ رونا دھونا۔" شاما خاموش تھی۔ اُس نے اس کے سینے سے اپنا سر اٹھایا۔ اور رومال سے آنسو خشک کئے۔

"شاما!" رمیش نے کہا۔ "لیڈی ڈاکٹر مس جانسن سے میری اچھی ملاقات ہے۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ اُس سے مشورہ لیں گے۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ بہت معمولی بات ہے یہ تو۔"

موٹر شاما کے بنگلے کے کمپونڈ میں داخل ہوئی ——— "وعدہ کرو اب نہیں رووگی؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے اس کا سر اپنی طرف کیا۔ اور اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

موٹر برساتی میں پہنچی۔ ایک نوکر نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ رمیش نے شاما کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا۔ "رونے دھونے سے کیا فائدہ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ——— یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ———"

جب وہ موٹر سے اتر چکی تو رمیش نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "گڈ بائی مائی ڈیر ——— گڈ نائٹ ——— اور ہاں کل دس بجے تیار رہنا ——— ہم لوگ جائیں گے۔"

"کہاں؟" شاما نے پیشانی پر شکن ڈال کر پوچھا۔

"لیڈی ڈاکٹر مس جانسن کے ہاں۔" اس نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

لوگ انھیں روٹیاں اور کھانے تقسیم کر رہے تھے۔ لوگ شور و غُل مچا رہے تھے بچے بلک رہے تھے۔ مائیں چیخ رہی تھیں ـــــ مگر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ ان نظاروں کا، اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ شاما کچھ کچھ خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اور رمیش اس کی پریشانی کی وجہ نہ معلوم ہونے سے پریشان ہو رہا تھا ـــــ اُس نے ایک ہاتھ سے اسٹرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ اُس کے گلے میں ڈال دیا۔

"شاما ـــــ پیاری شاما! بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا مجھے نہ بتاؤ گی؟ شاما! کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ شاما!"

اب شاما سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور سسکیاں بھرنے لگی۔ رمیش نے اسے اپنی طرف کیا اور اُس کا سر رمیش کے سینے پر آ گیا۔ شاما نے اسے زور سے پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رمیش کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کیا کہے ـــــ آخر کار شاما کی زبان سے کچھ ٹوٹے پھوٹے غیر مربوط الفاظ نکلے۔ رمیش ان لفظوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ خود بھی کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ مگر فوراً اس نے اپنی طبیعت پر قابو پا لیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"بس یہ بات! اس کے لئے تم اس قدر پریشان ہو ـــــ چھی! یہ بھی کوئی رنج کرنے کی بات ہے۔ شاما! تم سمجھدار، تعلیم یافتہ سوشل لڑکی ہو۔ اس قدر پریشان ہوتی ہو؟ یہ تو بہت معمولی بات ہے۔ انگلینڈ میں تو ایسے واقعات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ اور یہاں کلکتے میں ہماری سوسائٹی میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اب جو وہ گزشتہ ماہ مس خاں الہ آباد گئی ہیں اور مشہور ہے کہ کوئی اورنٹیل لینگویج کا امتحان دینے گئی ہیں۔ کیا تم اس بات کو سچ سمجھتی ہو؟ اور مس

سردار جعفری

بنگال

آبروئے ملک وملّت کے نگہبانو اٹھو
شمعِ جاں افروزِ آزادی کے پروانو اٹھو
حُرّیت کے پاسباں، عزت کے دیوانو اٹھو
مادرِ ہندوستاں کے دل کے ارمانو اٹھو
ناز ہے تلوار کو جس پر وہ بازو ہو تمھیں
وہ بہادر بھیم وہ خوددار ٹیپو ہو تمھیں

آج ہے بدلا ہوا رنگِ مزاجِ روزگار
کرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روحِ انتشار
آہ وہ بنگال وہ حُسن و محبّت کا دیار
ہو گیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار
اس مصیبت میں اگر اپنے بھی بیگانے رہے
"فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے"

جس اُفق سے روز ہوتا ہے طلوعِ آفتاب
جس نے پالی اپنے گہوارے میں روحِ انقلاب
جس کے فرزندوں نے دی تحریکِ آزادی کو آب
جس حسین وادی میں شاداب بجاتی تھی رباب
آج اُس میں قحط ہے آلام ہیں ادبار ہے
زندگی سے آج اُس کا ہر نفس بیزار ہے

تم بھی اُلجھے ہو بحثِ اندک و بسیار میں
اور وطن ہے صید، دامِ سکّہ و دینار میں
ایک سکتے کا سا عالم ہے در و دیوار میں
جسم کس کے بک رہے ہیں کوچہ و بازار میں؟
چند ٹکڑوں کے لئے جھانسی کی رانی بک گئی،
آبرو مریم کی! سیتا کی جوانی بک گئی!

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت
جس طرف دیکھو اُسی جانب نظر آتی ہے موت

چھین کر بچّوں کو ماؤں سے لئے جاتی ہے موت
سرنگوں ہے زندگی اور ناز فرماتی ہے موت

گاؤں ویران ہو گئے، ہر جھونپڑا انسان ہے
خطۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے

دھنس گئی ہیں بھوک سے آنکھیں دھنسے جاتے ہیں گال
ہڈیوں پر خشک چمڑے کی طرح لپٹی ہے کھال

ماؤں کے دُکھتے ہوئے شانوں پہ بچّے ہیں نڈھال
جانور میں بھی ہے بدتر آج انسانوں کا حال

جھونپڑے کل تک تھے جن کے مرغزاروں کے قریب
آج وہ دم توڑتے ہیں رہگذاروں کے قریب

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اٹھتا ہے بخار
مکھیاں ہیں بے کفن چادر اڑھاتا ہے غبار

چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار
بے بسی سے آج اُن کو چوستے ہیں شیر خوار

رینگ کر لاشوں سے ہٹ جانے کی طاقت بھی نہیں
ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں

خلوتیں سُونی ہیں، سُونی محفلِ احباب بھی
آج ویراں ہے حرم اور دیر کی محراب بھی

شوق بھی زخمی ہے زخمی ہے دلِ بیتاب بھی
ساز بھی ٹوٹا ہوا ٹوٹی ہوئی مضراب بھی

اس بھیانک خامشی کے درمیاں گائیگا کون؟
اس اندھیرے میں چراغِ طور دکھلائے گا کون؟

مشعلِ امید سینوں میں جلا سکتے ہو تم
قحط کی اور موت کی گردن دبا سکتے ہو تم

نیند کے ماتے جوانوں کو جگا سکتے ہو تم
خود مسیحا بن کے مردوں کو جلا سکتے ہو تم

زندگی کرتی ہے جب یورش تو گھبراتی ہے موت
زندگی سے بھاگنے والوں پہ چھا جاتی ہے موت

اک طرف دیوِ حکومت گردنوں پر ہے سوار
اک طرف جاپان کا لشکر قطار اندر قطار

اور اس حالت میں ہندستان فاقوں کا شکار ہوشیار اے مردِ میدانِ سیاست ہوشیار

ایک ہو جاؤ کہ دم سینوں میں گھٹ جانے کو ہے

قوم کا سرمایۂ اخلاق لٹ جانے کو ہے

متحد ہو کر اٹھو جس طرح دریا میں اُبال متحد ہو کر بڑھو جس طرح صحرا میں غزال

متحد ہو کر اڑو جس طرح شاعر کا خیال متحد ہو کر چلو مانندِ بادِ برشگال

پھر بہار آجائے شاخِ آرزو پھلنے لگے

کھیتیاں شاداب ہو جائیں ہوا چلنے لگے

صدیقہ بیگم سیوہاروی

چاول کے دانے

آج چھ دن ہو گئے کھانے کو کچھ ملا نہیں ہائے اللہ کیا کرے۔ اتنے دن گھر بار بیچ باچ کے سب کھا گئے۔ پر اب تو کچھ بھی نہیں ہے جو کھائیں۔ ایک کھاٹ ہے دو برتن۔ شفّو اور منّو یہ دو ہیں۔ نذیر بھی جب سے گیا۔ واپس نہیں آیا۔ یہ بچّے بلکتے ہیں۔ میں کیا کروں۔ تھوڑا سا بھی کھانے کو ہوتا تو میں خود نہ کھاتا اُنھیں کو کھلا دیتا۔ لیکن چھ دن سے ایک کھیل بھی منہ میں اڑ کر نہیں گئی میں نے برداشت کر ہی لیا۔ مگر یہ کیسے کر رہے ہیں۔ کتنے ضدّی بچّے تھے۔ چار دن سے کچھ کھایا نہیں پر روتے تک نہیں۔ ماں اُن کے سامنے مری۔ دادی کو انھوں نے مرتے دیکھا مگر روئے نہیں۔ جب سے چپ ہیں۔ ایک آدھ گھنٹے رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ماں ایسی چیز تو نہیں ہوتی پر بھوک نے یہ سب کر دیا۔ نذیر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنھیں چھوڑ کے کیوں چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا بچّہ کلکتہ گیا پر وہاں سے واپس نہیں آیا۔ کیا مجھے بھول گیا۔ پر اپنے بچّوں کا خیال تو کیا ہوتا۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود مصیبت میں پھنسا ہو۔ سارا سنسار مصیبت میں ہے۔

میرا نذیر ایسا تو نہ تھا کہ اپنے بچّوں کو بھول جاتا وہ جانتا تھا کہ اُس کا بوڑھا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔ آخر ان بچّوں کو کون کھلائے گا۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں نے خرچ کر دیا۔ اگر ہوتا تو میں اپنی بہو کو کیوں مرنے دیتا۔ پر اس میں اس کی

غلطی بھی تو تھی۔ بُرے بھلے جیسا بھی ہوتا گزر کرتی۔ مگر وہ اپنا کھانا بچّوں کو کھلا دیتی تھی۔ پر وہ بھی کیا کرتی۔ مامتا ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس نے اپنی جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ بڑے صبر کی لڑکی تھی۔ بھوک سے مری پر مرتے مرتے یہ نہ بتایا کہ بھوکی ہوں یہ کوئی چھپنے کی بات تو نہ تھی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ بھوک سے مرنے والے کی صورت کیسی ہوتی ہے۔ کسی نے ان دنوں مرتوں کو نہیں دیکھا۔ سارا گاؤں سُونا ہو گیا ہم نے اپنی آنکھوں سے بیسیوں کو مرتے دیکھا۔ مجلّی بھیّا۔ ابھی کل ہی مرے۔ ان کے دونوں بچّے آج صبح ہی مر گئے۔ خوب چلّا رہے تھے چاول! ——— چاول ——!! ——— اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی چھا گئی۔ سر چکرانے لگا۔ زمین گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ تھال میں چاول۔ پر وہ سویا تو نہیں۔ تھال میں چاول کیسے آیا۔

میرا نذیرا آگیا چاول لایا ہے۔ آدھ سیر سے کم تو نہ ہوں گے۔ لونڈا سمجھدار نکلا۔ میں تو جانتا ہی تھا کہ لائے گا ضرور چاہے دیر لگے۔ نذیر اس کی زبان سے آہستہ سے نکلا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی۔ چاول کہاں۔ وہ سو گیا ہوگا۔ خواب دیکھا ہوگا۔ پر بھوک سے نیند بھی تو اڑ گئی۔ خالی پیٹ میں پانی بھی تو لگتا ہے۔ سارے پیٹ میں جلن ہو جاتی ہے۔ جیسے سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ رگیں بھی کھنچنے لگتی ہیں۔ پر چھ دن سے پانی چھوڑ کھایا ہی کیا ہے۔ گھاس بھی تو سوکھ گئی۔ ایسے میں ہوگا کیا۔ کتنے دن ایسے گزریں گے۔ ہم نے بھی تو پہلے ٹھاٹ ہی کئے تھے۔ یہی جگہ تھی اب سے بہت دن پہلے جب کوٹھری میں چاول ہی چاول بھرا تھا۔ بہو آکر کہتی۔

"ابّا چلو۔ کھانا تیار ہے۔"

"پر بیٹی بچّوں کو تو کھلا دے۔"

"سب کو کھلا دیا۔"

"نذیر آیا؟"

"نہیں۔"

"کہاں گیا ہے؟"

"وہ ابھی کہاں! کتنی رات گئے آئیں گے۔ شام کو جب جاتے ہیں ایسے ہی آتے ہیں۔"

"معلوم نہیں بدماس کہاں گھومتا ہے۔ آج آنے دو۔"

"نہیں ابّا۔ آج اپنے دوست کے یہاں کھائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کہہ گئے تھے دعوت ہے۔"

"بڑا شوقین ہے۔ گھر تو کھایا نہیں جاتا۔ دوسروں کے یہاں کھاتا پھرتا ہے"

ابّا ——— با ——— اس باریک اور کمزور آواز نے اس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ وہ چونک پڑا۔ "شفّو" ——— اس نے کہا ہاں شفّو ہوگی۔ پر اس کی آواز ایسی تو نہ تھی۔ مگر ہے وہی بھوک کی مار کیسی ہوتی ہے؟ اگلے مہینے میں اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ "میری بٹیا ——— میری بٹیا!" ——— اس کی زبان سے نکلا جس نے خیالات کی گہرائیوں سے اُبھر کر فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ پر وہ اب جائے تو کیسے۔ اٹھنے کی طاقت نہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ بچّے بھوکے مر جائیں گے ——— ان کا مرنا ——— "ہائے اللہ" ——— دوبارہ اُس کی زبان سے آہستہ سے نکلا میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ میرا دھن ——— بس یہ بچّے ہیں۔ پر یہ کیسا دھن۔ یہ تو خود بھوکے ہیں۔ دھن اور بھوکا۔ اسے ہنسی آئی۔ وہ ہنسنا بھی تو بھول گیا ہے۔ یہ ہنسی بھی کیسی جس نے لب تک آکر آگے جانے سے انکار کر دیا ——— مگر وہ کیا کرے۔ اس دھن کو کیسے کھلائے کوئی یہ کھاٹ ہی لے لیتا اور ان بچّوں کے لئے کھانے کو کچھ دے دیتا۔ لیکن دے گا کون۔

ہر ایک کو چاول چاہیئے۔ ایسے میں کون خرید سے لیتا ہے پہلے سے بک جاتی تو کوئی بات بھی تھی۔ مجھ سے تو ہلا جاتا نہیں۔ کس کے پاس جاؤں ـــــ اتنے دن سے کھانے کو نہیں۔ اس نے پیٹ کی طرف دیکھا۔ ہائے اندر سے کتنا دُکھ رہا ہے۔

اُس کی پسلی کی ہڈیاں ـــــ کیسی سب کی سب دکھائی دے رہی ہیں۔ اُس کے بدن میں گوشت بھی ختم ہو گیا تھا۔ ان بچوں کا نہ جانے کیا حال ہوگا جب میرا یہ حال ہے جس نے سوا سیر کا گھی کھایا تھا۔ اس کی توہڈی ہڈی باہر دکھائی دے رہی ہے ـــــ یہ تو کھال روکے ہوئے ہے۔ نہیں تو کب کی باہر آجاتیں ـــــ پر یہ بچے۔ برا حال ہوگا ان کا ـــــ یہ بول کیوں نہیں رہے ـــــ شفّو اور منّو دونوں چُپ ہیں ـــــ لیکن ابھی شفّو بولی تو تھی ـــــ یہ چُپ کیوں ہو گئی ـــــ کہیں ایسا تو نہیں ـــــ اس کی آنکھوں میں سے ایک آنسو آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ اور حلقوں میں جم کر رہ گیا ـــــ اب یہ آنسو بڑھتے جا رہے تھے ـــــ بڑھتے بڑھتے ایک مرتبہ وہ بھی اندر سے نکل پڑے۔ لیکن کلّوں پر آنے کے بجائے ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگے ـــــ کلّوں پر تو کیا تھا۔ وہاں آپ گڑھا تھا اوپر والی ہڈی پر تھوڑی دیر رُک گیا۔ گویا وہ جائزہ لے رہا تھا اور پھر وہ قطرے دیر تک اسی انداز سے ٹپکتے رہے ـــــ اس نے اٹھنے کی کوشش کی ـــــ پر یہ سامنے سے کون آرہا ہے ـــــ کوئی چاول والا ہوگا چاول والا ـــــ اب اس کے جسم میں کچھ طاقت بھی آگئی تھی ـــــ کہیں یہ نذیر تو نہیں ؟ ـــــ نہیں یہ تو کئی آدمی ہیں۔ وہ تو اکیلا تھا۔ بولتے آرہے ہیں چل رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے پاس تک نہیں چل سکتا۔ چاول تو لایا ہوگا۔ پر ہاتھ میں تھالی بھی تو نہیں لیکن کوئی پکے چاول تھوڑا ہی لایا ہوگا۔ لیکن بورا بھی تو نہیں ہے! اس کی امیدیں ٹوٹ چکی تھیں

یہ لوگ اس لیے کس کام کے۔ ایسے تو دن رات آتے رہتے ہیں۔ اس نے سر جھکا لیا رات ہوئی جا رہی ہے۔ نیند آجائے تو کتنا اچھا ہو۔ صبح ہوتے پھر دیکھا جائیگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو مر جائے ـــــ موت ـــــ موت نہیں۔ وہ مرے گا نہیں۔ ابھی بہت وقت باقی ہے۔ وہ کوشش کرے گا۔ ضرور کہیں نہ کہیں انتظام ہو جائے گا۔ کسی طرح ان بچّوں کے دم میں دم آئے میرے لال۔

"بڑے میاں"۔

ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایسی آواز جو خواب میں سنائی دی ہے لیکن خواب کیسا۔ کتنے دن سے تو وہ سویا نہیں۔ کہیں کوئی بھوکا بھی سوتا ہے نہیں غلط بات ہے یہ کوئی ہے۔ ہوگا تو اپنے آپ ہی بولے گا۔ اس کا سر جھکا رہ گیا تھا ـــــ

"بڑے میاں کیسے بیٹھے ہو؟" ـــــ نہیں کوئی نہ کوئی تو ضرور ہے۔ نذیر کی آواز تو وہ پہچانتا ہے۔ اس نے بہ مشکل تمام سر اٹھایا۔ تین سفید پوش اس کے سامنے کھڑے تھے۔ بڑے موٹے تازے۔ سفید چاول کی طرح۔ چاول دیگچی میں پھول جاتا ہے۔ "جی سرکار"۔ اس کی زبان سے نکلا۔ "بھوکا ہوں سرکار" ـــــ "چاول" ـــــ "میرا نذیر ـــــ "شفّو اور منّو" ـــــ "ہائے سرکار ـــــ چاول ـــــ سرکار میں مر جاؤں گا۔ میرے بچّے بھی مر جائیں گے"۔

"کچھ پیسہ لو گے"۔

"چاول سرکار ـــــ بھوک"۔

یہ پیسے دیں گے۔ پر پیسے سے کوئی بچتا ہے۔ بچ تو سکتا ہے پر چاول کہاں ملے گا۔ کون جائے گا۔ میرے پیر اٹھتے نہیں ـــــ ہائے اللہ وہ کیا کرے چاول اُن کے پاس نہیں ـــــ پیسہ بھوک نہیں مارتا"۔ ایک نحیف آواز نے اسے گھبرا دیا۔ "ابا"۔

"سرکار یہ میری پوتی ہے۔ ہائے اُس نے پکارا تھا۔ مجھے پکڑ کر پہنچا دو کہیں ——— کئی دن کی بھوکی ہے۔ میں نے صبح سے اسے دیکھا بھی تو نہیں۔ منّو وہ تو ابھی تک بولا نہیں۔ سوتا ہوگا۔ پر نیند بھی کیسے آئے گی۔ بھوکا ہے اِس نے اٹھنے کی کوشش کی وہ گر پڑا ——— اندھیرا ———

"رات ہو گئی سرکار۔ اب کیا ہوگا۔ پر میری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اندھیرا۔ سر گھوم رہا ہے۔ ہائے اللہ ——— اللہ ———

دو ہاتھ اس کو اٹھائے تاریکی میں بڑھ رہے تھے۔ "لیکن ابھی تو شام ہے اندھیرا کیسا۔" اُن میں ایک نے کہا۔

"لیکن اندھیرا تو سارے بنگال پر چھایا ہے۔ جہاں موت ہو وہاں اُجالا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"موت ——— نہیں حضور ——— میں ابھی نہیں مرنا چاہتا میرے بچّوں کا کیا ہوگا۔ نذیر میرا بچّہ۔"

"نہیں۔ تم مرو گے نہیں۔ ہم تمہیں کھانے کو دیں گے۔"

"سرکار تم کتنے اچھے ہو" ——— اس کے ہاتھ آگے کو بڑھ گئے۔ "چاول ——— پر اُن کو پکائے گا کون ——— میری بٹیا ——— پر وہ تو اٹھ بھی نہیں سکتی۔

"نہیں ہم تم کو پھل دیں گے۔" اُن کی آواز میں بھی نقاہت ہو گئی تھی۔ حالانکہ انھوں نے ابھی دوپہر کو کھانا کھایا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"شوکت" اس کے دوست نے کہا۔ "شوکت دیکھو آنسو نہ آئیں۔ ہم کو تو انھیں دلاسا دینا چاہئیے۔

"پھل؟" بڈھے کی زبان سے نکلا۔ "کیسا پھل۔"

"کیلا ——— ہم تمہیں کیلا دیں گے۔"

"تم مذاق کرتے ہو۔ ہائے اللہ ایسے میں کوئی بھی نہیں پوچھتا۔"

"نہیں ہم بنگالی میں بات نہیں کرتے۔ لو یہ لیلو۔"

زرد رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ ایک نہیں چار کیلے۔ وہ اپنے بچّوں کی کھاٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"شفّو ——— منّو ——— کیلا" ——— اُس کی آواز میں ایک خاص قسم کی خوشی تھی۔ جیسے وہ موت پر ہنس رہا ہو ——— تو اب کیسے آئے گی۔ دیکھ میرے پاس تجھ سے بچنے کے لئے یہ ہیں کیلے۔ اُن سے کتنے آدمی بچ سکتے ہیں۔

اُس نے بغیر چھلکا اتارے کھانا چاہا۔ مگر اس کے منہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہائے میرے بچّے بھوکے ہیں ——— کیسا جلّاد ہوں میں ——— اُس نے ایک کیلا شفّو کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اُس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔

"بھوک" اُس کی زبان سے نکلا ——— کیلا اس کے منہ میں اپنا کام کر رہا تھا بجلی کی سی قوت اس کے جسم میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی نقاہت بھی جیسے دور ہو گئی ہو۔ ہاتھ پیر کمزور ہو گئے تھے۔ جیسے ان میں گوشت ہی نہیں تھا۔

"ابّا" ——— اُس کی زبان سے دوبارہ نکلا ——— جیسے اس کی قوّت ایک بار آ کر جا چکی تھی۔

"ابّا" ——— بھیّا مر گیا۔"

"ہائے اللہ منّو مر ——— ہائے منّو مر گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں شفّو کی آواز گونج رہی تھی۔ "ابّا بھیّا مر گیا۔"

"میری بیٹی ——— ہائے تو اکیلی رہ گئی ——— میرا بچّہ گھر کا چراغ بجھ گیا"

اُس کے دماغ میں خیالات نے آنے سے انکار کر دیا۔

"بڑے میاں! ——— یہ کیلا کھاؤ۔ لو" ———

کیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ جو عنقریب اس کی کمزور گرفت سے چھوٹا چاہتا تھا! انھوں نے کیلا چھیل کر اُس کو دیا۔ اُس نے چبانا شروع کر دیا ——— "چھلکا" اُس کی زبان سے نکلا۔ اس کو نہ پھینکئے یہ بھی کام آئے گا۔"

"ہمارے پاس بہت کیلے ہیں۔"

"یہ چھلکا بھی تو بیکار نہیں ہے۔" کاش یہ پہلے ہی مل جاتا۔ بڈھے کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک بہادر کی طرح موت سے لڑ رہا تھا۔ اور اب جیت بھی تو گیا تھا۔ لیکن اس طرح آخر کتنے دن کام چلے گا۔ کوئی روز روز ایسے آدمی ملتے ہیں۔ کل پھر بھوکا رہنا پڑے گا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس نے دوبارہ زندگی پائی ہے۔

"بیٹھی۔" وہ بولا "اب تو کیسی ہے۔ میری بٹیا بہت کمزور ہو گئی ——— تیرا ابھیّا۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا ——— کتنی دیر ہو گئی ——— اس کو کچھ معلوم نہیں۔ ہاں جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تینوں آدمی جا چکے تھے، تین چار کیلے البتہ کھاٹ پر رکھے تھے۔ شفّو ساکت و بے حس پڑی تھی۔

"شفّو بیٹا۔"

"ہاں ابّا ——— اب میں اچھی ہوں۔ ابّا اب میں اٹھ بھی سکتی ہوں۔ یہ آدمی کتنے اچھے تھے۔ میں نے تین کیلے کھائے ہے۔ پر آج تو کھانے کو مل گیا۔ کل پھر بھوکے رہیں گے ابّا ——— اگر اب کھانے کو نہ ملا تو میرا بھی یہی حال ہو گا جو" ——— وہ

کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہ سکی۔ اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

"ہاں بیٹا ـــــ ہم ابھی کچھ نہ کچھ تو کریں ہی گے چلیں سیٹھ جی کے یہاں دیکھو کچھ ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"بٹیا تو ان کے ہاں کام کرے گی۔"

"ہاں ـــــ پر وہ کھانے کو بھی دیں تبھی تو۔"

"ہاں دیں گے کیوں نہیں۔ اسی شرط پر تو میں تجھے دوں گا۔" وہ سوچنے لگا اگر یہی ہو جائے کہ اس کو سیٹھ جی کال تک اپنے یہاں رکھ لیں تو اچھا ہے۔ اس کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔ پر لڑکا سُنے گا تو کیا کہے گا کہ میری لڑکی کو بنا پوچھے بیچ دیا۔ لیکن اب تو وہ مجبور تھا۔ اس کے ہاتھ پیر میں اتنی طاقت کہاں جو وہ کام کر سکے۔ پھر ایسی مہنگائی میں کون کھلا سکتا ہے ـــــ وہ گھبرا گیا ـــــ میں سیٹھ جی کے پاس ابھی جاؤں گا۔ کچھ کہے وہ بڑا آیا ہے نذیر۔ اگر اس کو ذرا بھی خیال تھا تو خود ہی کیوں نہیں آ گیا۔ خود تو آرام سے بیٹھ گیا ـــــ اب میں کیا کروں۔ شفو کا ٹھکانا تو کرنا ہی ہے۔ منو ـــــ میرا منو ـــــ ہائے مجھے پتہ بھی نہ لگا کہ کب مرا ـــــ اس نے سر جھکا لیا۔

"بٹیا ـــــ چل سیٹھ کے یہاں چلیں۔ رات زیادہ ہو جائے گی ابھی تو چاند نکل رہا ہے ـــــ تو چل سکتی ہے۔"

"ابا ـــــ میں چلوں گی۔ چاول ملے گا ـــــ پھر بھیا کا کیا ہوگا ـــــ ہائے وہ مر گیا ـــــ میرا بھیا" ـــــ ایک ہلکی سی چیخ اس خاموش فضا میں ٹکرائی۔

"مت رو بیٹی ـــــ کیا کریں تھوڑی عمر تھی۔ کہاں تک برداشت کرتا۔ آج کھائے ہوئے بھی تو کتنے دن ہو گئے تھے ـــــ بس چپ رہو

آؤ چلیں بیٹھنے سے کیا فائدہ۔

* * * *

چاندنی رات تھی۔ ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی۔ جیسے جاگتے جاگتے کائنات سو گئی۔ نیند میں ہلکے ہلکے خرّاٹے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دو جاندار ڈھانچے اپنا سایہ ڈالتے جا رہے تھے۔ اُن کے پیروں کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی سوتے سوتے چارپائی پر کروٹ لے۔ چولوں کی آواز تھوڑی سی زندگی تو پیدا کر دیتی ہے نیند بھی دھوکا ہے۔ موت کا عکس ہے۔ لیکن ——— آخر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زندگی اور موت میں لڑائی ہو رہی تھی۔ زندگی ہار گئی تھی اور موت جیت رہی تھی۔ لیکن جوان کی آواز کروٹ لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ آخر یہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی کی کشمکش ہے۔ کون جیتا ہے۔ صبح ہونے دو آپ پتہ لگ جائے گا۔"

دو تاریک سائے اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک بڈھا دوسری عورت مگر نہیں لڑکی۔ بھوکی عورت۔ بھوکی لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔

بڈھے کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس کی پوتی اس کے ساتھ تھی! آخر وہ جگہ کونسی ہے جو آنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کی آنکھوں کے آگے کبھی مردہ منّو کی شکل آتی۔ اور کبھی زندہ سیٹھ کی۔ وہ اس کے یہاں جا تو رہا ہے۔ پر کہے گا کیا۔ وہ بگڑے گا تو نہیں۔ نہیں آدمی تو اچھا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے سائے کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ دوسرا سایہ پیچھے ہو چکا تھا۔ شفّو! تو پیچھے رہ گئی۔" وہ رک گیا۔ شفّو آگے بڑھ گئی۔ اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ کیسی مصیبت ہے۔ بھوک نے یہ حال کر رکھا ہے کہ چلنے کو بھی طبیعت نہیں چاہتی۔ رک گئے تو ایسا معلوم ہوا کہ اب چلا ہی نہ جائے گا۔ بیٹی میں

بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔"

وہ آگے چلتا رہا۔ اگلی موڑ سے تھوڑا پرے سیٹھ کا گھر ہے۔ ہے تو نزدیک پر پہنچنے میں دیر لگے گی۔ دونوں ساتھ مل گئے۔ ہوا نے سایوں کو حرکت دی اور وہ رُک کر کھڑے ہو گئے۔ ہوا نکل گئی۔ دانتوں کے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہیں کوئی دانت نہ ٹوٹ جائے۔ یہ دانت کمزور کیوں ہو گئے۔ میں نے تو کچھ کھایا بھی نہیں۔ اس نے منہ بند کرنے کی کوشش کی۔ سردی کتنی پڑ رہی تھی۔ پاس کہیں آگ بھی تو نہیں۔ اب تو سیٹھ کا گھر بھی ایسا دور نہیں ——— سیٹھ کا گھر ——— اندر بڑا گرم ہو گا۔

"چل بیٹی آگے چلیں" ——— جاندار ڈھانچوں نے چلنا شروع کر دیا ان کا سایہ بھی تو کہہ رہا تھا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ وہ کیا کریں وہ تو خود بھوکے ہیں۔ انھیں خود سردی لگ رہی ہے۔ جب کھانے کو نہیں تو کپڑا کہاں سے لائیں۔ جب کھانے کو ملتا تھا۔ جبھی کپڑا کتنا مہنگا تھا۔ اب کیا ٹھکانا ہو گا۔ ٹاٹ بھی تو مہنگا ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں کب سستا ہو گا ——— کپڑا ملے نہ ملے۔ چاول سستا ہو جائے ——— بھوک ——— بھوک ——— اس کے دماغ میں گونجا۔ سیٹھ کا مکان تھوڑی ہی دور رہ گیا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ سیٹھ کیا کہتے ہیں۔ لیکن وہ کہے گا کیا اس کی بیٹی ——— نہیں پوتی شفو کو لے لے کام کر دیا کرے گی۔ بڑی سیدھی ہے۔ کام کرے گی پر کھانے کو دینا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے ہائے مگر شفو نوجوان ہے۔ سیٹھ کے گھر کے لوگوں کا اعتبار۔ وہ رک گیا۔ بیٹی ٹھہر جا وہ رک گئی اور کیلے کا چھلکا چبانے لگی۔

جوان لڑکی سیٹھ کے گھر۔ پیسے والے ہیں۔ چاول والے ہیں ——— کھانے کو تو ملے گا۔ پر میری آبرو۔ کنبے والے کیا کہیں گے۔ کنبے والے رہ کہاں گئے ہیں۔

پر میں اپنے واسطے تھوڑا ہی کر رہا ہوں۔ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ دونوں وقت کھانے کو ملے گا۔ جان بچ جائے گی۔ پر آبرو بھی تو کوئی چیز ہے۔ نہیں وہ اپنی شفّو کو مرنے نہیں دے گا ——— "چل بیٹی چلیں" ——— شفّو کی جان بچ جائے گی۔ شفّو تو ڈھانچ ہو گئی۔ اس کا بیاہ ——— پر اس سے یہی اچھا ہے کہ سیٹھ جی کا کام کرے گی۔ کچھ سہارا ہو جائے گا۔ اتنے بڑے آدمی۔ اب ایسا بھی کیا۔ ان کے بھی تو بہو بیٹیاں ہوں گی۔ آبرو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے میں ہنسا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی کیسی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ بڑے لوگ ایسے تو نہیں ہوتے ——— سیٹھ کا مکان یہی تو ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہوں گے۔ کون سنتا ہے بھوکے کی بات ———

"بڑے میاں۔ جاؤ یہاں سے آگے بڑھو۔"

"بھیّا! سیٹھ جی" ——— وہ آگے بول نہ سکا۔

"کیا چاہتے ہو سیٹھ جی سے۔"

"سرکار ہم ملیں گے۔"

"اوہو۔ آپ بڑے گورنمنٹ کے افسر ہیں۔ جو ملیں گے۔ جیسے کنٹرول افسر۔"

افسر تو اس کے سمجھ میں آگیا۔ پر اس سے پہلے یہ کیا کہا تھا۔ اس نے اس کے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"بھوکے ہیں۔ انھیں سے کام ہے۔"

"لو وہ آگئے۔ آپ ان سے مل لیجئے۔"

وہ آگے بڑھا۔ "سیٹھ جی" ——— اس کی زبان سے نکلا۔ سیٹھ جی سے کیسے بات کرے۔

"کیا بات ہے او بڈھے۔"

"سرکار یہ میری لڑکی ہے۔ اس کو لے لو۔ کھانا کھلانا۔ تمہارا کام کر دیا کرے گی۔"

"چلو یہاں سے۔ مجھے فرصت نہیں۔ بے کار باتیں مت کرو۔ کس کے پاس ہے جو کھلائے گا۔"

سیٹھ جی چلدیئے۔

"یہیں بیٹھ جا بیٹی" ——— گھر جانے سے کیا فائدہ۔ وہاں کیا دھرا ہے جہاں کھانے کو نہیں وہ گھر ہی کیا۔ وہ گھر اس کا گھر نہیں ——— اتنا موٹا تازہ آدمی ذرا بھی خیال نہیں۔ ہم بھوکے ہیں رحم نہیں آتا۔ بڑے ظالم ہیں پر بیٹھے رہو۔ کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی۔ کوئی نہ کوئی آوے گا تو ضرور۔ بڑے بڑے لوگ رہتے ہیں۔ سیٹھ خود کتنا بڑا آدمی ہے۔ بڑا بھاری کاروبار ہے۔ سُنا ہے اس کے یہاں چاول ہی چاول ہے۔ منوں چاول۔ پر یہ نکالتا کیوں نہیں۔ بیچتا تو ہو گا پر دام زیادہ ہے۔ کون خریدتا ہے۔ ڈھائی روپیے سیر۔ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں۔ کال سے پہلے کتنی گاڑی چاول سے بھری اس نے آتے دیکھی۔ گھڑگھڑ کی آواز برابر آرہی تھی۔ کوئی گاڑی ہو گی وہ اناج سے بھری۔ اتنا اناج ہوتا تو آدمی بھوکے ہی کاہے کو مرتے۔ فصل بھی اچھی ہوئی۔ پر سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا۔ اب کیا ہو گا۔ گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ضرور اس میں غلّہ ہے اس نے سوچا۔ اتنا غلّہ کہاں سے لائے۔ وہ تھک گیا تھا۔ ایسی باتیں سوچنے سے کیا فائدہ۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے ہات کانپ رہے تھے ——— جاڑا ——— جاڑا ——— وہ گھبرا گیا۔ صبح کیسے ہو گی۔ بارہ بجنے میں کتنی دیر ہے۔ چاند ابھی تو چمک رہا ہے۔ اس نے دیکھا بہت دن سے اسے بھی تو نہ دیکھا تھا۔

"کون ہے۔" اس مہیب آواز نے اسے چونکا دیا۔

بڈھے نے سر اٹھایا۔ "سرکار ہم بھوکے ہیں۔"

"اچھا تم کو کھانے کو ملے گا۔ یہ لڑکی تمہاری ہے؟"

"جی۔"

"اچھا چلو میرے ساتھ آؤ۔" وہ دونوں اُن کے ساتھ ہو لئے۔ سیٹھ جی کا لڑکا اس نے سوچا سیٹھ جی سے اچھا ہے۔ بڑا موٹا کوٹ پہنے ہے۔ اسے سردی لگنے لگی۔ پر اب کچھ کھانے کو تو ملے گا۔ یہاں دالان میں تو باہر سے اچھا ہی۔ اس نے اپنے جسم میں گرمی محسوس کی ——— شفو راستے بھر کچھ نہ بولی۔ آخر کیا بات ہے کہیں ناراض تو نہیں۔ لیکن وہ کیا کرے مجبوری ہے۔ اس کا تو ٹھکانا ہو ہی جائے گا اس کے بھلے کے لئے تو اس نے یہ کیا ہی ہے، وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا ایک کمرے میں پہنچ کر رک گیا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت موٹا تازہ نوجوان کھڑا تھا۔ کالا کوٹ پہنے کالا ——— کالا ——— گونجنے لگا۔ ہر چیز کالی ہے ہو لئے دو میری بٹیا کا ٹھکانا تو ہو ہی جائے گا۔

"بڑے میاں! تم اس لڑکی کو چھوڑ جاؤ تم کو پیسے مل جائیں گے۔"

"سرکار میں بھوکا ہوں۔"

"اچھا تم کو چاول مل جائیں گے" ——— اس لڑکی کا کیا نام ہے۔

"شفو ——— حضور۔"

"بڑی دُبلی ہے۔"

"سرکار بھوک کی مار ہے۔"

"اچھا شفو! تم میرے ساتھ آؤ۔ بڑے میاں کو نوکر چاول لا دیگا تم جا سکتے ہو۔"

اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ آج اس کی پوتی بھی اس سے چھٹ گئی۔ یہی تو ایک سہارا رہ گئی تھی۔ اب وہ کیا کرے گا۔ بھوک لگ رہی ہے ـــــ پر چاول تو ملیں گے ـــــ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت خوش ہو یا رنجیدہ ـــــ اس کی طبیعت میں ایک نامعلوم سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چاول پانے کی خوشی ـــــ اس کی بھوک مر جائیگی اب وہ چاول کھائے گا ـــــ کتنے دن ہو گئے اس نے چاول کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اس نے خوش ہو کر اپنا سر اٹھایا ـــــ "منّو" اس کی زبان سے نکلا ـــــ اس نے اپنے سر کو جھکا لیا ـــــ وہ افسردہ ہو گیا۔ اس کے دماغ نے آگے سوچنے سے انکار کر دیا۔

"بڑے میاں ـــــ یہ لو چاول۔"

"لاؤ بھیّا۔" اس نے سر اٹھا کر کہا ـــــ ڈیڑھ پاؤ تو ہوں گے ضرور ـــــ

"بس چلو یہاں سے۔"

اس نے پھٹے کرتے کی طرف دیکھا۔ دامن کا یہی تو ایک حصّہ صحیح و سالم تھا اس نے دامن میں چاولوں کو لپیٹ لیا۔ اب وہ بھوکا نہیں مرے گا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا ـــــ ذرا سی دیر میں وہی سڑک سامنے آ گئی ـــــ وہی چاندنی رات ـــــ وہی سردی ـــــ کافی رات ہو گئی تھی ـــــ شفّو ـــــ میری شفّو کا تو ٹھکانا ہو ہی گیا ـــــ پر میں نے ڈیڑھ پاؤ چاول پر اس کو بیچ دیا ـــــ ہائے اللہ ـــــ نذیر سنے گا تو کیا کہے گا۔ میں نے اس کی لڑکی کو بیچ دیا ـــــ ڈیڑھ پاؤ چاول پر ـــــ ڈیڑھ پاؤ چاول ـــــ معلوم نہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے ـــــ اس کی بیٹیا ـــــ اس نے غلطی کی ـــــ

آج کا تو ٹھکانا ہو ہی گیا تھا۔ کیلا کافی تھا۔ کل کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو جاتا ——
اب وہ واپس کیسے جائے۔ اس کے پاؤں جواب دے چکے تھے ——— پھر وہ
جا بھی کہاں رہا ہے ——— سردی ——— ہوا ——— اس کے پاؤں کانپ رہے
تھے ——— ہائے اللہ اب وہ کیا کرے ——— اس نے اپنی پوتی کو بیچ دیا ——
اب وہ اپنے لڑکے کو کیا جواب دے گا۔ جیسے اس کا لڑکا اس کی آنکھوں کے
سامنے کھڑا ہے۔

"ابّا! تم نے شفّو کو بیچ دیا ——— کیوں بیچا؟ ——— خود نہیں کھلا سکتے تھے
——— تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو اس کی آبرو بیچ دی۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنی
پوتی کی عزت بیچ کر تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔ مر جانے دیا ہوتا ——— تمہاری اتنی
عمر ہونے کو آئی۔ عزت آبرو کا خیال نہیں ——— اور یہ تمہاری گود میں کیا ہے"۔
وہ چونک پڑا ——— چاول اس کی گود سے چھوٹ کر زمین پر بکھر گئے ——— اس
کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ دماغ چکّر کھانے لگا۔ شف ——— او ——— اس کی
زبان سے نکلا ——— وہ گر پڑا ——— شف ——— ہی ہی ہی ——— چاند بڑی
آب تاب سے چمک رہا تھا۔ لیکن تاریکی سے زیادہ ڈراؤنی تھی وہ چاندنی ———
سائے نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ چاول کے
دانے چاندنی میں چمک رہے تھے۔

———+———

مخدوم محی الدین

بنگال

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہم

وہ درِ ہندوستاں، وہ سحر و نغمے کا دیار
دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا، بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پہ سود خوار
ایک ہو کر دشمنوں پہ وار کر سکتے ہیں ہم
قبر کے روزن سے اپنا منہ نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا، نوالا موت نے

شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

اُمّتِ مرحوم ہو یا ملّتِ زنّار دار

اُن کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار

مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار

آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچّوں کی پکار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

آج اپنا گھر عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو

ہم بڑھے جائیں گے رستہ پر خطر ہی کیوں نہ ہو

ہم لڑے جائیں گے دشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو

اپنی وردی خاک و خون میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم

کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم

زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

محبوب حسین جگر

حدِّ نظر

کسی گہرے غار میں، کسی اندھیارے زمین دوز تہہ خانے میں نُور کی مدّھم شعاع جن رکاوٹوں سے ٹکراتی، مشکلات کو عبور کرتی اور پھر ہیبت ناک تاریکی میں نُور پیدا کرتی۔ ہے۔ اس مدّھم شعاع ہی کی طرح رقیہ میری زندگی میں اجالا بن کر آئی تھی، ہماری محبّت، قہقہہ بردوش ایک کہانی تھی۔ مشیّت نے اپنے کرم سے ہماری حیات کے اس کھیل کو عام روایات کی طرح حزنیہ نہیں بنایا تھا۔ بلکہ عشق و محبّت کی جبین پہ ہماری زندگی ایک درخشاں لکیر سی تھی۔ لیکن پرمیشور کی نسل والوں نے تہذیب و تقدس اور آزادی امن کا نام لے کر ہماری زندگی کو تاراج کیا ہے۔ "افتخار ایشیا" اور "وارث شرق" کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ انسان نے انسان کو ستایا ہے، گویا بھائی نے بھائی کہہ کر بھائی کو لوٹ لیا، تاراج کر دیا۔

رقیہ رنگون اپنے میکے گئی تھی کہ ہماری محبت کا پہلا ظہور اس کی ماں کے ہاں جنم لے اور جب یہ نوخیز و نوآغاز کلی صفدر ہماری محبت کی جاودانی نشانی بنا۔ اس دنیا میں آیا۔ رقیہ نے مجھے اپنی کمزوریوں اور نقاہت کے باوجود خط لکھا تھا کہ "حمید یہ ننھّا سا بچّہ کچھ تمہارے کچھ میرے نقوش لے کر آیا ہے۔ بالکل تمہاری طرح کشادہ سینہ، روشن

جیسیں، بڑی بڑی آنکھیں۔ اور جب تم خود اسے دیکھ پاؤ گے تو بتاؤ گے کہ اس نے میرے کونسے خط و خال پائے ہیں۔" میں ابھی رنگون پہنچا بھی نہ تھا اور رقیہ کو بتلا بھی نہ سکا تھا کہ صفدر کو تم نے کیا دیا ہے کہ وہ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ جاپانی درندے، ملکوں اور قوموں کی آزادیاں سلب کرتے اور مجبوروں اور محکوموں کو روندتے ایک ناپاک دور وحشت کی بناء ڈالتے سماٹرا، جاوا، ملایا سے رنگون پہنچے، ان کے جلو میں کوہ آتش فشاں کی طرح تباہیاں تھیں۔ جب وہ رنگون پہونچے پھر نہ رنگون کے پگوڈا میں گجر بج رہے تھے، نہ مندروں سے قرن کی آواز آ رہی تھی، نہ آتشکدوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ نہ زندگی گا رہی تھی۔ بلکہ بموں کے دھماکوں اور شعلوں اور دھوئیں کی چادروں میں شہر لپٹا ہوا تھا۔ فضاء میں خوف کا راگ جیسے تحلیل ہو گیا ہو۔ سسکیوں اور آہ و بکا سے رنگون گونج رہا تھا۔

میں نے صفدر کی پیدائش کی خبر سنتے ہی چھٹی کے لئے درخواست دیدی، لیکن میرا کامریڈ دوست رمیش مجھ سے کہنے لگا کہ "حمید بھائی! اب تم رضا نہ لو جب تم رقیہ بھابی کو لینے جاؤ گے۔ تبھی صفدر کو دیکھ لینا، آج دشمن بنگال کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ اس دیش کے ایک سپوت نے ان دشمنوں سے مل کر ہمارے ماتھے پر ایک بدنما داغ چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا دیس عفریت و اہرمن کا باب الداخلہ بننے نہ پائے۔ دشمن کو یہیں روک دو۔ آج ہمارا جوٹ و سن کا یہ کارخانہ چوبیس گھنٹے اسی لئے چل رہا ہے کہ ہماری مدد سے درندے موذی بنگال میں نہ آئیں۔ ہند ماتا کی پیاری زمین موت کی رقص گاہ نہ بن جائے۔ یہ مشین، کارخانے، فضا میں بلند چمنیاں گو بے جان ہیں۔ لیکن ان کے سینے کی دھڑکن اور گڑگڑاہٹ دشمن پر ایک کاری وار ہے۔ اس لئے

تم اب چھٹی نہ لو۔" بات درست تھی۔ میں اس وقت رنگون نہ جا سکا۔ پھر جب رقیہ کے باپ نے مجھے لکھا کہ آ کر اب رقیہ کو لے جاؤ۔ میں چھٹی لے کر رنگون روانہ ہوا لیکن میرے پہنچنے سے دو تین دن پیشتر ہی پرمیشور کی نسل نے عزرائیل کا کام بھی خود ہی اپنے ہاتھوں لے لیا۔ رقیہ کے باپ نے مجھے رقت بھرے لہجے میں سُنایا کہ "صفدر ماں کی چھاتی سے لگا ہوا ایک ملبے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ رقیہ نے اپنے جسم کو صفدر کی سپر بنا کر مامتا کا پورا حق ادا کر دیا۔ خود یہ ننھا معصوم زخمی ہو گیا۔ اگر اس کے رونے کی صدا نہ آتی تو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ رقیہ کہاں دبی پڑی ہے۔" اس ننھّے سے صفدر کو لیکر میں فوراً رنگون سے واپس ہو گیا۔ رقیہ کی یہ بے بہا نشانی جسے اس نے اپنی زندگی دے کر مجھے عطا کی ہے۔ میری اس مایوس و اداس دنیا کا اجالا ہے۔ لیکن اس ننھی سی جان کو بھی دو ہفتے سے ملیریا کا سخت حملہ تھا۔ ڈاکٹر کونین کے لئے کہتا ہے لیکن اس بھوکے بنگال میں کونین، کوہِ نور بن گئی ہے۔ مگر میں نے یہ طے کیا اس نوشگفتہ کلی کے لئے میں کونین لا کر رہوں گا۔ چونکہ رقیہ کی یہ تنہا نشانی ہے۔ پھر میری آنکھوں کا یہ تارا ہفت اقلیم بھی تو ہے۔ میں اپنی زندگی کی قربانی پر دو گرام کونین حاصل کروں گا۔ لیکن گھر میں ایک پائی بھی نہ تھی، دو ہفتے سے میں صفدر کے بُخار کی وجہ سے کارخانے بھی نہیں گیا تھا گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ جو کچھ اثاثہ تھا اس کو میں نے اپنے جوان سال بھائی کی موت پر صرف کر دیا تھا۔ دسمبر کی سردیاں اور ہُگلی کا کنارہ غریبوں کیلئے خود ایک شدید قسم کا ملیریا ہے۔ اور جب یہ ننھا معصوم خود ملیریا میں مبتلا ہو۔ تو جو قیامت آئے گی۔ اس خوف سے میں لرز رہا تھا۔ پھر کئی ڈراؤنے خیالوں نے بھی سنگین کی طرح چبھویا کہ میں رقیہ کی محبت کی یادگار کو اپنی بے بسی کے باعث شاید تباہ ہوتے ہوئے

دیکھ لوں۔ پھر اس آسمانی دُنیا میں رقیہ مجھے ہی قصوروار تصوّر کرتی رہے گی! اس رات یہ معصوم عجب کرب میں مبتلا تھا، بُخار سے پنڈا پھنک رہا تھا، بحران میں یہ کمسن روح تلملا رہی تھی، ہاتھ پیر اینٹھے جا رہے تھے! اور زبان لبوں پر بار بار آجاتی تھی۔ میں دیکھ نہ سکا کہ جو بچّہ خود ماں کے دودھ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کی خشک زبان اور سوکھے ہونٹ یوں ترستے رہیں، اندھیری سنسان رات میں صفدر کی تکلیف اس کی جاں کنی کا عالم مجھے گریہ کناں بنا دیا تھا۔ بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ کسی رئیس کے گھر نقب لگاؤں کسی مہاجن کا گھر لوٹ لوں کسی راہگیر پر حملہ کروں، اور اس سے سب کچھ چھین لوں تاکہ صفدر کا کچھ تو درماں ہو سکے۔ لیکن ان ارادوں پر عمل نہ کر سکا۔ چونکہ میں ڈر رہا تھا کہ جب میں ان پر عمل کر کے واپس لوٹوں گا تو صفدر باقی ہی نہیں رہے گا۔ اس لئے میں نے بڑی کشاکش کے بعد یہ طے ہی کر لیا کہ میرا جوان بھائی ایک ہفتہ پیشتر ہی دفن کیا گیا ہے۔ آج اس کا کفن ایک قیمتی سرمایہ ہے، اس دو گز چادر کی قسمت میں صفدر کی زندگی ہو جانا لکھا ہے۔ پھر میں نے ضمیر کی اندرونی ملامت کو کچل کر قبرستان کا راستہ لیا۔ کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے قبر کو کھودا۔ قبرستان کی خاموشی مجھے ڈرا رہی تھی کہ میں جوان بھائی کی لاش کو دیکھ نہ سکوں گا۔ ضبط نہ کر سکوں گا۔ دو تین مرتبہ میں نے مٹی کو پھر ڈھکیلا، پھر کھودا۔ اور جب صفدر کی زرد صورت سامنے آگئی میں نے ساری مٹی ہٹا ڈالی۔ پھر دفعتًا مجھے یوں معلوم ہوا کہ میں نے صفدر کی اور اپنی قبر بھی تیار کر لی ہے اور کچھ لمحوں، ساعتوں یا گھنٹوں میں یہیں پہنچ جاؤں گا۔ بھائی کی لاش بے کفن پڑی ہوئی تھی۔ یہ اندھیری سنسان رات اور گہری تاریک ہو گئی جب گھر لوٹا۔ صفدر سرد ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں صفدر کی آخری ہچکی، اس کا دم واپسیں،

اس کی آخری نظر۔ کیا مجھے تلاش تو نہیں کر رہی تھی۔ مجھے بلا تو نہیں رہی تھی، دیکھ تو نہیں رہی تھی ؟

اس ارض پر شاہوں و شہنشاہوں کی آنکھ کے آنسو کسی کی محبت میں روضے اور مقبرے بن جاتے ہیں، لیکن میری ہفت اقلیم دوسرے روز صبح میونسپلٹی کے حوالے کر دی گئی جو کلکتے کی شاہراہوں و گلی کوچوں سے لاوارث لاشوں کو جمع کرتی پھر رہی تھی

خس و خاشاک کی طرح صفدر کی لاش لاری میں ڈال دی گئی۔ اور میری غمناک نگاہیں حدِ نظر تک لاری کو دیکھتی رہیں۔ جو میری ہفت اقلیم کو نہ جانے کہاں لئے جا رہی تھی ؟ نہ کہیں نشانِ گورستان، نہ سنگِ مزار، نہ لوحِ تربت کہ میں صفدر کو تلاش کر سکوں تاکہ اس کی لحد کچھ تو میرے اشکِ غم چھپا سکے۔ وہ تو حدِ نظر کے اُس پار ہو چکا ہے۔

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینکدو اس کا جسمِ خاکی!
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں،
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دُنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حُسنِ بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے!
جوان دلکش حسین چہرے سے چھین لی عمر نے تابناکی!
کھُلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے

بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخر شش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی!
اسی لئے کیا اُگا کریں گے
یہ نرم پودے، یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سُلا دیں؟

پرتھوی ناتھ شرما

میں مر نہیں سکتا

وہ اکیلا ہی تھوڑا وہاں پڑا سسک رہا تھا۔ اُس کے آس پاس اُس جیسے بہت سے آدمی موت کی آخری گھڑیوں میں زندگی کی کتاب کے صفحات کو اُلٹ پلٹ رہے تھے لمبے لمبے کالے ہاتھ، تپ دقی چہرے، گڑھے میں دھنسی ہوئی آنکھیں، اور پیٹ کا اندھا کنواں..... تمام ایک مرض کے شکار تھے، تمام ایک ہی بات کا انتظار کر رہے تھے۔ گِدھوں کی کالی چونچوں اور لمبی لمبی گردنوں کے منتظر، لیکن اُن میں مرنے کے بعد بچے گا بھی کیا، محض ہڈیاں، انتڑیاں، نسیں، سوکھی ہوئی رگیں، اور افسردہ پھیپھڑے اور ایک المناک ٹریجڈی کا پس منظر، جسے دُنیا نے دیکھا اور خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اُس سرچشمے کی طرف جس سے موسیقی آرٹ کلچر کی ندّیاں اُبلتی رہی تھیں۔ مگر جو آج سوکھا جا رہا تھا۔

لیکن مہیم بھٹاچاریہ نے تلخ کروٹ لیتے ہوئے اپنے دل کو تسلّی دی۔ "کیا میں مر سکتا ہوں۔ کیا میں مر جاؤں گا۔" کیا پچھلے دنوں میں جو کچھ گزرا ہے۔ سب اس کے مارنے کا سامان تھا۔ کیا وہ واقعی مر رہا تھا۔ کیا اس کے آس پاس لیٹے ہوئے آدمی سب کے سب مر رہے تھے۔ کیا اس کے آس پاس ادھر

پھیلے ہوئے دیہاتوں میں موت کا شکار ہونے والے آدمی مر رہے تھے۔ کیا سارا بنگال مر رہا تھا، ایک بڑا صوبہ جس کے ایک ننھے سے دیہات میں اس کا جنم ہوا تھا اور دُنیا کے تمام بڑے آدمی دیہاتوں میں ہی تو پیدا ہوتے ہیں یا پرورش پاتے ہیں۔ مسرت چندر ایک ہگلی کنارے بسنے والے دیہات میں پیدا ہوا تھا۔ رابندر ناتھ کا شانتی نکیتن بھی دیہاتی فضا میں پھل پھول رہا ہے۔ ودیاپتی، مدھوسودن دت بنکم اور نذرالاسلام۔ کتنی بڑی دھرتی ہے۔ اُس کا پرانت جس میں وہ پیدا ہوا۔ کتنے بڑے بڑے آدمیوں کی ماں اور بڑے آدمی کی ماں یوں بھوکی مرجائے۔ یوں تڑپ تڑپ کر بھوکی مرجائے۔ جب ماں کے بیٹے لائق ہو جاتے ہیں تو ماں کبھی بھوکی نہیں مرتی۔ لیکن بیٹوں کا کیا قصور جب رزق ہی ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔ جب اناج کی کوٹھیاں بڑے بڑے پیٹ والے ظالم آدمیوں کے قبضوں میں ہوں۔ جب کلکتے میں ریشم بک رہا ہو اور دیہات بھوکے مر رہے ہوں۔ جب ناچ گھروں میں ہندوستانی عورت اور مرد شراب پی رہے ہوں اور ناچ رہے ہوں اور چلّا رہے ہوں بھوکی ماں کو بچاؤ۔ ماں مر رہی ہے۔ ماں آلام کی سل تلے پسی جا رہی ہے۔ ہاں ہاں ہم شراب کے جاموں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم ماں کو نہیں مرنے دیں گے۔ ہم اپنی ماں کو سوکھ سوکھ کر مرنے نہیں دیں گے۔ ہاں ہاں ڈیر ہم قربانی کریں گے۔ بھوکا ہے بنگال بھائی۔ بھوکا ہے بنگال ——

بھوکا ہے بنگال —— نہیں نہیں۔ اُسے زندگی کی آخری گھڑیوں میں فضول باتوں میں وقت نہیں گنوانا چاہئے۔ اُسے تیزی سے بہت دور چلنا چاہئے۔ اتنی دور جب وہ گاؤں کی پاٹ شالہ میں بڑھتا تھا۔ اور اپنے باپ کے باغ سے گھیا

توڑ کر پنڈت جی کو بطور رشوت کے لا کر دیا کرتا تھا۔ اور اوانتی پور گاؤں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دھان کے کھیت لہلہاتے تھے۔ بھات کی کمی نہیں تھی۔ اور اس کی ماں پوجا پاٹ سے نبٹ کر تلسی کے تھالے میں جل چڑھا کر جلدی سے تھال میں بھات پروس دیتی تھی۔ اور وہ بھات کھا کر گاتا گاتا سکول چلا جاتا تھا اسے اب تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ گا کیوں سکتا تھا۔ سب ہی بچے تو گانا گاتے تھے۔ پاٹھ شالا کے میدان میں درختوں کے تلے کیرتن ہوا کرتا تھا اور گیند مارا ماری کا کھیل چلتا تھا۔ اس کی ماں گا سکتی تھی۔ اس کا باپ گا سکتا تھا۔ تمام دیہاتی آدمی گا سکتے تھے۔ جب کھیتوں میں سنہرا دھان لہلہاتا تھا تو رات کو کتنی جگہ کیرتن ہوتا تھا۔ لوگ باگ کھیتوں میں کام سے نبٹ کر درختوں تلے چوپال میں مکدجی رائے بہادر کی حویلی کے احاطے میں۔ چٹوپادھیائے کے اکھاڑے میں جھانجھ گھڑتال لے کر گاتے تھے۔ "رادھے کرشنو رادھے کرشنو۔ رادھا رادھا ـــــ شری کرشن چیتن پربھوت نند" ـــــ اور پنڈت گرو موہن اپادھیائے اپنی گردن کے گرد ریشمی چادر ڈالے، ماتھے پر لمبا تلک لگائے دیا کھیاں دیتے تھے۔ "بنگ بھوم۔ بنگالہ دیش شنو شنو دادا۔ شنو ہمارا بنگال دیش ہے نا۔ اس پر پربھو کا بہتا کرپا ہے۔ بس ہم لوگ کو بھات ملے جائے اور پہننے کو دستہ۔ ہم کسی شالے کا پروا نہیں کرے گا۔ ہم شالا زیادہ زیادہ نہیں مانگتا۔ ہمارے دیش میں بڑا بڑا آدمی ہوا ہے۔ ٹھاکر رابندر۔ شرت چندر۔ چٹوپادھیائے۔ اور ہم ہندو مسلمان میں بھی فرق نہیں سمجھتا۔ نذرول اسلام نذرول اسلام بھی ہمارا آدمی ہے۔ نذرول بھی نے ہمارے دیش کا گورب بڑھایا ہے۔ ہمارا دیش ـــ گرو موہن اپادھیائے کا دیش.....

پاٹھ شالہ میں بھیم نے ودیا پتی اور چنڈی لاس کو پڑھا۔ اس نے پاٹھ شالے کے بعد قصبے کے سکول میں جانا شروع کر دیا۔ متوسط طبقے کے لڑکوں کی طرح اُسے پالا پوسا گیا۔ وہ سویرے تین میل پیدل سکول جایا کرتا تھا۔ ماں اسے چار پیسے اور خرچ کرنے کو دیتی تھی۔ ہاں اس نے اپنی دادی کو پوپلے منہ میں کئی بار اپنی بہو کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ پیسہ احتیاط سے خرچ کرنا چاہیئے۔ لڑکیاں ہاتھی کی طرح بڑھتی ہیں اور پھر جب تک ان کو سونے سے لادھ نہ دیا جائے تب تک کوئی ان سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چندا سے چار پیسے ہی کافی تھے۔ وہ کبھی رس گُلّے کھا لیتا تھا کبھی سندیش۔ چم چم رسوگلّا۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے لئے وہ ایک اچھی سی بھیلی خرید کر لے جاتا تھا۔ اس کی ماں اپنے بچّے کی عقلمندی دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ اور دعا کرتی تھی۔ "اے دُرگا ماں میرا بچّہ پڑھ لکھ کر شہر کے دفتر میں بابو ساشے بن جائے۔ خوب دان دہیز لے کر سکندری بہو آئے۔ ننّھا ننّھا پوتا ہو۔ اور پانی دینے والا پیدا ہو جائے۔

بھیم نے ابھی آٹھویں کلاس پاس ہی کر پائی تھی۔ کہ اس کی سگائی ایک اچھے گھرانے میں ہو گئی۔ ماں کے بدلے، دادی کی دعاؤں نے اثر کیا۔ اور جب میٹرک پاس کر کے بھیم بھٹاچاریہ قصبے کی چنگی میں کلرک ہو گیا۔ تو اس کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی سُندر سانولے رنگ کی استری نے آتے ہی اُس پر جادو کر دیا جب تک ہمارے دیش میں بھات ہوتا۔ سارا دیش بھوکا نہیں مر سکتا۔ اسے گرو موہن اپادھیائے کی بات یاد تھی۔ اس لئے پہلے سال ایک لڑکی نے جنم لیا۔ سولہ مہینے بعد ایک لڑکا ہوا۔ اور پانچ چھ سال میں بھیم بھٹاچاریہ چار بچوں کا باپ بن گیا۔ اس کی بیوی کا بدن گھٹ گیا۔

دُبلا پتلا جسم، مدقوق سا چہرہ، لیکن جب تک بھات ملتا ہے تب تک ....

وہ بچّوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ لیکن اپنی نوکری سے ناراض تھا۔ مگر پھر بھی اس امید میں جی رہا تھا۔ کہ اس کے تین لڑکوں میں سے کوئی نا کوئی بڑا آدمی بنے گا۔ بہت بڑا مانوش۔ وہ ہرگز ہرگز ان میں سے کسی ایک کو بھی کلرک نہیں بننے دے گا۔ وہ انھیں سنگم، مسرت، ٹیگور اور نذر الاسلام پڑھنے کے لئے دے گا۔ ان کو سنگیت رَق بنائے گا۔ ڈھاکے کے سادھو پالیہ میں پڑھنے کے لئے بھیجے گا۔ یہ سب تیس روپے کی نوکری کے بل پر۔ اور اُن دس پندرہ روپوں کے بل پر جو اُسے اوپر سے پڑ جاتے تھے۔ پُرانا جمع جتھا سب بہن کی شادی پر خرچ ہو چکا۔ باپ پہلے ہی جاڑے بُخار سے مر چکا تھا۔ اور ساتھ ہی بیوی، چار بچے، بوڑھی ماں۔ پورا کنبہ تھا۔ اور کل ملا کر پینتالیس روپے ہاں ہاں جب تک بنگالا دیش میں بھات ملتا ہے۔ تب تک وہ ان پینتالیس روپوں کے بل پر مستقبل کی عمارت کھڑی کر سکتا تھا.....

لیکن سمے، اندھیرے کی طرف دوڑتا گیا۔ پچھم میں بم پھٹے۔ اور آواز اوانتی پور کے لوگوں کے کانوں میں پہنچی۔ آہستہ آہستہ بیماری پھیلتی گئی۔ شہروں سے لوگ باگ دیہات میں بھاگ کر آنے لگے۔ بھیم اپنے گھر سے پاس والے قصبے کی چنگی تک فاصلہ طے کرتا کرتا کتنی ہی افواہیں سنتا۔ کوئی کہتا کہ لڑائی ساری دُنیا میں پھیل جائے گی۔ کُل سو میں سے بیس آدمی بچیں گے۔ قیامت نزدیک ہے۔ اور بوڑھی عورتیں اپنے پوپلے منہ سے تشویشناک لہجے میں کہتیں "کس کا شاپ لگ گیا ہے۔ کلجگ میں پاپ بہت ہو رہا ہے۔ ان دھرم بھرشٹ کرنے والوں کا ستیاناش جائے۔ جب دھرم کرم نہیں رہے گا تو پرجا بھوکی ہی مرے گی۔ مگر جنگ کے آغاز میں بھات ملتا تھا۔ بھیم کا گذارہ

ٹھیک طرح چل رہا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت بیتتا گیا۔ توں توں بھات کا بھاؤ بڑھتا گیا ایک سے چار، چار سے سولہ، سولہ سے اسّی، بھیم کا سینا ٹوٹ گیا۔ مہینے کے اندر بھات کا بھاؤ اتنا چڑھ گیا کہ وہ پینتالیس روپے میں صرف بھات خرید کر ہی اپنے کنبے کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے بھات نہ ملنے کی افواہیں بھی اڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ بھات نہیں ملے گا۔ روپیہ انٹی میں لئے لئے پھریں گے۔ تب بھی بھات نہیں ملے گا اپنی زمین جائداد تک اور زیور تک بیچو گے تب بھی بھات نہیں ملے گا۔ نہیں نہیں بھیم کو یقین ہی نہیں آیا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاہے چاول کی قیمت سو گنی بڑھ جائے۔ لیکن چاول ملے گا ضرور۔ ایسا کیا بُرے سمے تھوڑے ہی آگیا ہے۔ لیکن ——— ؟

وقت بھیم کا انتظار نہیں کرتا۔ خاص طور سے جب سے انسان انسان کا حکّام بننا سیکھ گیا ہے۔ رزق خُدا سے ارضی دیوتاؤں کے پاس پہنچ کر مغلوب، محکوم و مجبور تک نہیں پہنچتا۔ کیوں پہنچے انسان کو اپنے آس پاس دولت کے انبار لگانے کی بیماری لگ گئی ہے نا۔ اپنے آس پاس اناج کے ڈھیر لگا لو۔ اور عام آدمی کو بھوکا مرنے دو۔ عام آدمی بھوکا مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ عام آدمی کو بھوکا مرنا ہی چاہیئے۔ ہاں بھیم بھی تو ایک عام آدمی تھا۔ وہ تو محض ایک ایسی کل کا پرزہ تھا جس کا کام ہو کہ محض ایک ہی حرکت میں مشغول رہے۔ جسے بیرونیات کی خبر نہ ہو۔ جسے ان تمام باتوں سے واقفیت نہ ہو جو اُن گزرے سالوں میں انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ وہاں اور اس کے گاؤں کے لوگ شہری رشتے داروں کے پاس بھاگنے لگے۔ شہروں میں بھات ملنے کی امید تھی۔ وہاں کے لوگ دیہاتیوں سے زیادہ خوش قسمت تھے۔ وہاں رزق بانٹنے والے لنگر خانے کھل رہے تھے۔ آدمی

آدمی کی سیوا کرنے کا بہانا کر رہا تھا۔ لیکن خوراک ان کو نہیں مل رہی تھی۔ جن کو ملنی چاہیئے تھی۔ تب بھی امید ہی زندگی کو سہارا دیتی رہتی ہے۔ بھیم کلکتے میں بسنے والی موسی کے گھر اپنی بوڑھی ماں، بیوی، بچوں کو ساتھ لے کر کلکتے چلا آیا۔ اور وہ گھر سے بھی چاول کا تھوڑا بہت ذخیرہ جو انھوں نے برے وقت کے لئے رکھ رکھا تھا۔ ختم ہو چلا تھا اور دکانیں خالی تھیں اور گاہک بے شمار۔ فصل میں چار پانچ ماہ کی کسر تھی۔ اور اپنی ماں اپنے بچوں اپنی بیوی کی طرف دیکھتے دیکھتے اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ موت ان کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ آدمی کتّے کی طرح مر مر کر سڑک پر پڑا رہے گا۔ اور کوئی اسے جلایا دفنا نہ سکے گا۔ اور دوسری بات یہ بھی واقع ہو رہی تھی کہ دیہاتوں میں بیماری پھیلتی جا رہی تھی۔ ملیریا برسات کا موسم اور ملیریا۔ کونین ملے تو کچھ بنے۔ لیکن جب عام شہری آدمی کے لئے کونین نہیں تو عام دیہاتی آدمی کے لئے کیسے نصیب ہو۔ بھوک کا دیوتا بیماری کے دیوتا کے ساتھ تنگ بھومی پر ہنس رہا تھا۔ اور چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ بھوک خوش نصیبوں کا ہی حصّہ ہے۔ تمہارے دیش میں ناج ہے لیکن تم بھوکے مرو گے۔ تمہارے بھائی تم کو بھوکا مار دیں گے۔ تمہارے بھائی اپنے خزانوں کو بھرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے پیٹوں کو نہیں۔ تمہارا پیٹ ایک بہت بڑا گڑھا بن جائے گا جس کو وقت کے آنسو بھی ایک مدت میں بھر پائیں گے۔"

کلکتے میں بھیم پہنچ تو گیا۔ لیکن وہاں بھی بھات ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک ایک سیر چاول کے لئے بارہ بارہ گھنٹے انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ لمبی لمبی لائین، جم غفیر، بھوک سے چلّاتے ہوئے بچّے، اور سر پیٹتی ہوئی عورتیں۔ اور دل ہلا دینے والی قیمتیں، سارا زیور بیچ ڈالنا پڑا۔ بلیک مارکٹ سے کنکر ملے چاول خریدنے کے لئے جن کو

جانور بھی کھانا نہ پسند کریں۔ لیکن جب کھانا ہی نہ ملے تو کیا کیا جائے۔

موسی کا کنبہ، بھیم کا کنبہ، اور کھانے کے لئے بھات۔ تین مہینے میں سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ اور تین مہینوں میں کلکتے کی آبادی کتنے ہی فی صدی بڑھ گئی۔ تگنی، چوگنی، پانچ گنی ـــــ دیہات کے پژمردہ چہرے، بھوکے پیٹ، خیراتی لنگروں میں ہزاروں کی بھیڑ، کسی کو ملا۔ کسی کو نہیں ملا۔ اور جو کچھ ملتا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ناممکن ہو چلا۔

بھیم اپنے بچّوں سمیت، اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جگھوں جگھوں میں گھومنے لگا بھیڑ میں بیماری کے جراثیم تھے۔ دیہاتوں سے ملیریا زدہ لوگ آ رہے تھے۔ بھٹی کی موافق دہکتے ہوئے بدن۔ محض سوکھے سے پنجر۔ اناج کے دانے دانے کے لئے مارے مارے پھر رہے تھے۔ پیڑیوں پہ کنبے کے کنبے پڑے تھے۔ آدمی سب کچھ بھول گیا تھا۔ اسے صرف کھانا چاہیئے۔ صرف کھانا۔ صرف اناج کے دو دانے خواہ وہ کسی حویلی کی رسوئی سے بہنے والی نالی کے زیریں حصّے میں ڈھونڈے۔ ڈشٹ بن میں تلاش کرے۔ بدروؤں میں گھس کر ٹٹولے۔ اور خواہ اسے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے بھائیو سے کتّے کی طرح لڑنا پڑے، اناج، خوراک محض خوراک، عشق نہیں چاہیئے۔ مخملی گدّے اور بستر نہیں چاہیئے۔ اچھا لباس نہیں چاہیئے۔ محض خوراک لیکن بھوک تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بیماری تھی کہ پھیلتی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر آدمی بھوک اور جاڑے سے مر رہے تھے۔ لیکن ان کے لئے رونے پیٹنے کے لئے وقت نہیں تھا جب کھانے کی تلاش سے فرصت ملے تب ہی تو کوئی روئے پیٹے۔ خاندان کے خاندان منتشر ہو گئے۔ مر کھپ گئے اور بیماری اور بھوک میں مقابلہ سا ہو گیا۔ کون زیادہ زیادہ انسانوں کو زندگی سے محروم کرتی ہے۔

پہلے موسی کو بخار چڑھا۔ اس کے بعد بھیم کی ماں کو، بھیم کے دو بچوں کو۔ اور جب ناج نہ ملے تو کونین کہاں۔ ایک جنون تھا جو سب کے سر پہ سوار تھا۔ ڈاکٹروں کو بڑی حویلیوں سے کم ہی فرصت ملتی تھی۔ خیراتی شفاخانے کہاں تک۔ ہزاروں کی تعداد میں مریضوں کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ اور رشتہ داروں، عزیز و اقارب، بیٹے بھائیو کے پاس اتنا وقت کہاں کہ تیمار داری کریں۔ تیمار داروں کی طرف سے بہتر گلیوں کی خاک چھاننا تھا۔ ممکن ہے کہ کہیں سے ناج کا دانہ مہیّا ہو جائے۔ کسی خیراتی لنگر سے بھات یا روٹی میسر ہو جائے۔ اور سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بیمار مر جائے۔ کھانے والوں کی تعداد کم ہو جائے اور خوراک کے حصّے کی مقدار بڑھے۔ اور بھیم تو چند دنوں سے سوچنے لگا تھا کہ ایسی آفت آ جائے جس سے سارے آدمی ختم ہو جائیں۔ سارے نہیں تو ایک بڑا حصّہ موت کے منہ میں چلا جائے تاکہ پیٹ بھرنے کا سامان تو نظر آئے اور دوسرے انسانوں کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں کالے کالے خیالات ابھرنے لگتے۔ اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور سے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے اپنی موسی کا گلا گھونٹ ڈالنے کے لئے۔ اپنی ماں کا گلا گھونٹ ڈالنے کے لئے۔ اپنی بیوی کا۔ اپنے بچّوں کا۔ رد تھن کا، اشوک کا، کارگی کا۔ اجیت کا شریمتی نیلا دیوی کا، ماتا کھوکھی کا، موہنی سوکھی کا، سب کا، اور اس کے بعد اپنا، تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مصیبت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن وہ اپنے دل کو تسلی دے دیتا بھوک نہیں تو بیماری یہ فرض انجام دے دیگی۔ اپنے گاؤں میں وہ دو وقت کھاتا تھا۔ کلکتے میں ایک وقت۔ اس کے بعد ایک وقت کا آدھا حصّہ۔ اس کے بعد ایک وقت کا چوتھائی حصّہ۔ اس کے بعد اس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ گھاس کھا لے گا۔ اپنی بیوی کو

چھال کھلائے گا۔ لیکن اپنی ماں کو اپنی موسی اور بچوں کے لئے ایکا وقت کے چوتھائی حصّے کا ضرور انتظام کرے گا۔ وہ انھیں مرنے نہیں دے گا۔ وہ انھیں جاڑے بُخار سے بھی مرنے نہیں دے گا۔ وہ ایک نہ ایک دن اُن مرجھائے ہوئے چہروں پہ خوشی کے پھول مُسکراتے ہوئے دیکھے گا۔ اُن کو بسنت موسم میں پیلی دھوتیاں پیلے کُرتے اور پیلے پھولوں کی مالا پہنے ہوئے دیکھے گا۔ ہاتھ میں بانسری لے کر پھر وہ رادھا کرشنو، رادھا کرشنو کی دھن نکالے گا۔ وہ دو وقت کھانا کھا کر دیہات کے پکشیوں اور نیلے آسمان کو ہی دیکھ کر اپنا من پرسن کر لے گا۔ اور دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت، بھات کی فراوانی..... اہا! ــــ کاش محض سوچنے ہی سے پیٹ بھر سکے۔

موسی مری۔ اس کے بعد رو تھن۔ دونوں ایک دن آگے پیچھے، اشوک کو بُخار نے جھنجھوڑ کر رکھدیا۔ ماں سوکھ کر پنجر ہو گئی۔ دو بچے اور بیوی، اور ماں تمام شریر سوکھنے لگے۔ ملریا اور بھوک۔ پہلے دو بیماریاں تھیں۔ اب سوکھا کی بیماری چل نکلی اور بھیم نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنی بچّی، اپنے دو لڑکوں، ماں اور بیوی کو لے کر بڑی سڑک پر جا پڑے گا۔ اس سڑک پر لے جائے گا جہاں ایک ایک چپاتی کے لئے ہزار ہزار آدمیوں میں جنگ ہوتی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ میں چپاتی آجائے۔ گھاس اور درخت کی چھال کھانے کے بعد تھوڑا اَن تو پیٹ میں پہنچے۔ کم از کم بدن میں اُس روز تک تو حرارت قائم رہے گی جب تک حالات پلٹا نہ کھائیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اگر کوئی خیرات بانٹتا بھی آئے تو پھر سب کو ہی تو الگ الگ حصّہ ملے گا۔ اُس کی بیوی کو، ماں کو، اشوک کو، کارگی کو، اجیت کمار کو

شریمتی نیلا دیوی کو، ہاں کب تک درخت کی چھال کھائیں گے اور نالیوں کے اندر بہنے
والے گلے سڑے ٹکڑے، اور پھلوں کے پھینکے ہوئے چھلکے.....

سڑک پر ایک اس کا ہی کنبہ نہیں تھا۔ اور بہت سے کنبے موجود تھے۔ بیشتر لوگ
دیہات سے نکل حویلیوں کو چھوڑ کر شہر چلے آئے تھے۔ دیہات کی بیماری اور اناج
کی ناموجودگی نے اُن سب کو شہر کی طرف راغب کر دیا تھا۔ لیکن بھوک وہاں بھی اُن کا
ساتھ دے رہی تھی اور کلکتے کے بازاروں میں ریشم بک رہا تھا۔ مائیں اپنی بچیوں
کی چھاتی کھول کھول بولی لگوا رہی تھیں۔ ایک روٹی کی خاطر عصمتیں ویران ہو رہی تھیں
بھوکی آنکھیں وقت کی بنجر دھرتی کی جانب گھور رہی تھیں۔ ایک ایک آنہ میں لڑکیاں
بک رہی تھیں۔ آہ بھوک۔ جتنے جسم چاہو خرید لو۔ لیکن روٹی عوض میں دو۔ پیسہ بھی
نہیں۔ بازار لگا تھا۔ جس کا جی چاہے آئے پسند کرے اور لے جائے۔ اور اونچی
اونچی حویلیوں میں تہذیب کے اس دور میں بھی گھر سے باہر بھوکے مرنے والے لوگوں
کے موجود ہوتے ہوئے بھی داد عشرت دی جائے۔ اور بھلا ایسا موقع بھی کبھی ہاتھ
آیا کرتا ہے۔ جب غریب بے بس دیہاتی بھوکے مریں اور سڑکوں پر خوب صورت
لڑکیاں بکیں۔ ایک ایک آدمی دس دس خرید سکتا ہے۔ اس نے پہلے ہی سے بھات
کی بوریاں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ وہ کھڑکی سے جھانک جھانک کر باہر مرنے والے انسانوں پر
ہنس سکتا ہے۔ قید خانے کے اوباشو، زنجیروں میں مسکرانے والے، ابریشم کے تاروں
کے جال میں پھنسے ہوئے ناقص انسانو ہتم اپنی ماں کی تک بے حرمتی کر سکتے ہو۔ ہاں
کی بے حرمتی ہو اور بیٹا کھڑا تماشا دیکھتا رہے۔ ناج کی کوٹھیوں میں ہزاروں لاکھوں
بوریاں لگی ہیں۔ اور باہر آدمی یوں بھوکا مرے کہ وہ قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ اچھا

مرنے دو آدمی کو، لٹنے دو عصمتیں، اور گِدھوں کو اجازت دیدو کہ وہ لاشوں سے سوکھے سڑے مواد کو نکال نکال کر کھا جائیں۔

جمیم نے بھی سوچا کہ وہ سڑک سے اٹھ کر کسی اونچی حویلی کے نزدیک جائے نزدیک ہی نہیں جائے بلکہ دروازہ کھٹکھٹائے، اور گھر کے رہنے والوں سے کہے تم ہم سب کو خرید لو۔ مجھ کو میری بیوی کو میرے بچّوں اور میری ماں کو۔ ہم کو صرف ایک وقت کے کھانے کا آٹھواں حصّہ ہی دے دو فقط۔ ہم لوگ سیوا کرتے رہیں گے لیکن سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک ساتھی نے اُس سے کہا۔ بیکار ہے بابو۔ اگر کوئی جوان لڑکی ساتھ ہو تو کام بن سکتا ہے۔ ہاں! گارگی کو کل پانچواں برس تو ہے۔ اگر وہ خود دس سال زیادہ عمر کا ہوتا۔ تو گارگی پندرہ برس کی ہوتی۔ پندرہ برس کی عمر ٹھیک ہے نا! اور پھر وہ اپنی بیٹی کی چھاتی کو..... نہیں نہیں مہاپاپ ہے۔ بھوک زیادہ انتظار نہیں کرتی۔ سات دن، آٹھ دن، پندرہ یا زیادہ سے زیادہ مہینہ درختوں کی چھال اور گھاس کہاں تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہیں۔ ناج چاہیئے۔ اگر گارگی پندرہ برس کی ہوتی۔ اُس کے رُخساروں پر لالی ہوتی اور ہونٹوں پہ گلابی رنگ، تب، تب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بہت سے آدمی اس کے بازو اپنے ہاتھوں میں دبا کر خیرات دیتے، بہت سے اس کی طرف آواز سے کسنے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینکتے۔ وہ کبھی بھی اپنی بچی کی چھاتی کھول کر کہتا مول لگاؤ نا! کبھی بھی نہیں۔

گارگی! وہ اپنی بچّی کی طرف دیکھتا اور چپ ہو جاتا۔ اپنی ماں اور بیوی کو بچوں کی نگرانی، اور اگر کوئی خیرات بانٹنے آئے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہوا خود اَن کی تلاش میں نکل جاتا۔ اس کی داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے۔ گالوں پر بال بے ڈھنگے طریقے

سے کھڑے تھے۔ اس کی چال میں کمزوری آتی جارہی تھی۔ اور اگر وہ کسی لنگر کے پاس جہاں روٹیاں بٹتی ہوں پہنچا بھی تو اس کی ہمّت جواب دے جاتی۔ زبردست مال لے کر اُڑ جاتے۔ کمزور انسان بے بسی سے دیکھتے رہتے۔

وقت گزرتا جارہا تھا۔ سارے کنبے کو ناج کا دانہ منہ میں ڈالے دس دن بیت چکے تھے۔ چھال کھاتے کھاتے اُن کے ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ پیٹ خراب ہوگیا تھا۔ کڑوی کڑوی اینٹھن اور کم طاقتی، پیٹ کے اندر چلنے والی چھریاں، اور آہستہ آہستہ کمزور پڑنے والی قوت گویائی۔ بس ایک پہاڑ تھا جو پیٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ سینوں کو کوٹ رہا تھا۔ آنتا کو تکلیف دے رہا تھا۔ اور لوگ مر رہے تھے۔

دس دن کے اندر اندر نیلا دیوی، اشوک، گارگی، اجیت کمار سب پرلوک سدھارے سیوامنڈی کی ایمبولین کار اُن کو ڈال کر شمشان بھومی لے گئی۔ لیکن وہ نہیں مرا۔ شاید اسے درختوں کی چھال اور گھاس موافق آگئی تھی۔ شاید وہ موت کا منظر دیکھنے کے لئے زندہ تھا ہاں موت کا ناچ دیکھنے کے لئے۔ انسان اس بے وقوفی کا منظر دیکھنے کے لئے جو ایمبولین کار بھیج سکتا ہے۔ خوراک نہیں بھیج سکتا۔ جہاں خیرات بانٹنے سے بھی فرقہ وارانہ تفریق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جہاں ماں باپ لڑکیوں کی چھاتی کھول کھول کر کہہ سکتے ہیں دیکھو مول کرو ـــــ ہاں جب تک اس کے سر تلے دبی ہوئی گٹھڑی میں چھال ہے تب تک وہ اُسے ہی چوس چوس کر زندہ رہے گا۔ تب تک وہ گرو موہن اُپادھیائے کا دیا کھیا کر ہمارے دیش میں بڑو بڑو آدمی پیدا ہوتا ہے یاد رکھے گا۔ اس لئے وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور ایمبولین کار والوں کو لاشوں کو لادتے ہوئے دیکھتا رہا۔

* * * *

اب وہ اکیلا ہے۔ اشوک، روتھن، نیلا وغیرہ وغیرہ سرگ لوگ میں بیٹھے، ودیاپتی چنڈی داس اور رابندر ناتھ کو سُن رہے ہوں گے۔ وہاں ناج اور شہد کی کمی نہیں ہوگی۔ وہاں سب کچھ ہوگا۔ وہاں مائیں اپنی بچیوں کی چھاتیوں کو کھول کر نہیں کہتی ہوں گی لگاؤ مول۔ ہاں! اور وہاں فرقہ وارانہ تفریق ایک سرے سے ہوئے گی ہی نہیں۔ سب لوگ آرام کے ساتھ بھات کھا رہے ہوں گے۔ درختوں تلے کرتن ہو رہا ہوگا۔ کھیتوں میں دھان لہرا رہا ہوگا۔ وہاں امیر آدمیوں کی حویلیاں ہی نہیں ہوں گی۔ وہاں دیہات ہی نہ ہوں گے۔ جہاں سے چاول شہر کی منڈیوں میں پہنچ جاتا ہے تو واپس دیہات کا رُخ نہیں کرتا۔ اور جن کاشتکاروں کے گھروں میں بھرا ہوا بھی ہے تو اس خود غرضی کے زمانے میں کیوں ایک دوسرے کی امداد کرے۔ پچھم کے افقوں پر عبارت ہی یہی لکھی ہے کہ خود غرض بنو۔ ایک آدمی بہت پلتا ہے جب سیکڑوں مرتے ہیں۔

پچھلے دو گھنٹوں میں وہ کئی بار سوچ چکا ہے کہ وہ ایک بار تو اپنے منہ سے کہدے "میں مر نہیں سکتا"۔ لیکن اب وہ صرف خیالات کے دھندلے ہجوم کے علاوہ رہ کیا گیا ہے اس کی بینائی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ ہا ہا! دھان کے کھیت لہرا رہے ہیں۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک پکشی اڑ کر جا رہے ہیں۔ آسمان نکھر گیا ہے۔ اس کے بچے روتھن، اشوک، گارگی۔ ارے سب کے سب ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر درخت کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ نیلا درانتی پر مچھلی چھیل رہی ہے۔ ماں کھلے ہاتھ میں چاقو سے اور ایک گیت کی دُھن چاروں طرف پھیلی جا رہی ہے۔ گیت جو دھرتی میں سے پھوٹ نکلا ہے اور چاروں طرف پھیل رہا ہے۔ کبھی نا مرنے والا گیت۔ اس نے کوشش کی وہ ان بچوں کو پکارے اور اُن سے کہے گیت کو سنو۔ یہ نا مرنے والا گیت مجھ کو کبھی نہیں مرنے دیگا

کسی کو بھی مرنے نہیں دے گا۔ ہم امر ہیں۔۔۔۔ لیکن وہ سب کیا ہوئے۔ چلے گئے۔ واپس بہشت میں۔ جانے دو۔ وہ بھی وہاں آیا چاہتا ہے۔ اس کی بھوک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانے والی ہے۔ وہ پھر جنم لے گا۔ اچھے دنوں میں پیدا ہوگا۔ وقت لامحدود ہے۔ کیا کبھی انسان انسان کو کھانے سے محروم رکھنا نہ بھول جائے گا۔ کیا کبھی ارضی دیوتا آپس میں تقسیم کر کے نہ کھائیں گے۔ کیا کبھی ٹوٹے پروں میں اڑان نہیں آئے گی۔ بس آخری بار انسان بھوکا مر رہا ہے۔ آئندہ نہیں مرے گا۔ آئندہ وہ زندہ رہے گا بھیم بھٹاچاریہ ——— ہاں ہاں وہ آئندہ زندہ رہے گا۔

بہشت کی کھڑکی سے اس کے بچے۔ اس کی ماں، اس کی بیوی اسے جھانک جھانک کر دیکھ رہے ہیں۔ پگلے ذرا اسے یہ تماشہ تو اور دیکھنے دو۔ کہ آخر بڑی بڑی لڑائیاں بھوک کو بڑھانے کے لئے ہی لڑی جاتی ہیں۔ آخر غریب لوگ ستائے جانے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ دیہات ناج پیدا کرنے کے بعد بھی شہر کے محتاج رہتے ہیں۔ پرماتما کی نگری کا انصاف نرالا ہے۔ سڑکوں پہ بہادر مر رہے ہیں جنھوں نے بھوک سے مقابلہ کیا ہے۔ جن کے مرنے کا ایمبولین کاروں کو انتظار ہے۔۔۔۔

.....

پھر وہ مر گیا۔ اس کے سر تلے چھال کی پوٹلی دبی تھی! اور دھان کی ایک سوکھی خالی بال! اور ایک نامرنیوالا گیت اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ لامحدود، غیر فانی، اور ہمیشہ زندہ رہنے والا

نظر حیدرآبادی

بنگال

بیوگی، بے چارگی، غربت، تباہی، انتشار
وحشیوں کی حکمرانی، نکبتوں کی گیرودار
ایک شہرِ نغمہ، اور اتنے مصائب کا شکار!
حسنِ سرتاپا محبّت آشنا کو کیا ہوا
سوچتا ہوں اب غریبوں کے خدا کو کیا ہوا

زندگی سہمی ہوئی، ڈوبی ہوئی افکار میں
ان گنت لاشوں کی نذریں موت کی سرکار میں
سر برہنہ پھر رہی ہیں عصمتیں بازار میں
"نورِ ایمانی" حقائق پر بپھرتا ہی رہا
وقت کا چنگیز اپنا کام کرتا ہی رہا

پیٹ کی دوزخ نے جھلسا دی تمدّن کی بہار
بھائی بہنوں کی محبّت کا ہے دامن تار تار
ہائے معصوموں کی چیخیں وائے ماؤں کی پکار

اشکِ غم لوٹے گئے دردِ نہاں لوٹا گیا
زندگی کو کاروانِ درکارواں لوٹا گیا

وہ فدایانِ رہِ آزادیِ ہندوستاں
وہ مجسّم آگ، وہ سرتا بپا برقِ تپاں
آج وہ ہیں اور بزدل موت کی سفاکیاں

الاماں یہ ظلم، یہ بیداد، ایسی دارو گیر
لٹ گئی ٹیپو کی عظمت، چھن گیا ارجن کا تیر!

وہ حسینانِ وطن، وہ حُسن سازانِ وطن
نازنیں، نازآفریں، نازک بدن، گُل پیرہن
بے بسی ہے ان کی تربت بیکسی ان کا کفن!

شعلۂ حسن و جوانی دیکھنے والا نہیں،
کوئی ان سڑتے ہوئے ڈھانچوں کا متوالا نہیں،

اس طرف آئیں کدھر ہیں وہ "خدائی فوجدار"
جن کی پیغمبر ہے دولت جن کا خالق روزگار
اور ہوا دیتے ہیں جن کو سامراجی ہرزہ کار

اُن سے کہہ دو اب یہ دُنیا یوں نہ جیتی جائے گی
کب تلک شاہنشہی جمہور کو بہلائے گی!

ایک ہو جائیں تو وہ جادو جگا سکتے ہیں ہم
حشر ڈھا سکتے ہیں ہم، طوفاں اٹھا سکتے ہیں ہم

مرتے مرتے موت کو نیچا دکھا سکتے ہیں ہم
جانتے ہیں اس طرف تم ہو ادھر جاپان ہے
وقت بتلائے گا اک دن کس کا ہندستان ہے

ابراہیم جلیس

چور

"رانی ——— تم سچ مچ کی رانی ہو۔"

مارواڑی لڑکے نے رانی پر منڈلاتے ہوئے کہا ——— رانی سچ مچ کی رانی نہیں نہیں تھی۔ بلکہ مارواڑی لڑکا نشے میں دُھت ہو رہا تھا۔ وہ تو ایک کنگال کنواری تھی جس کو رانی کا نام دے کر اس کے ماں باپ نے اپنے دیس کی روایتی محبت کا ثبوت دیا تھا۔ بڑی پیاری صورت تھی اس کی مگر بھوک کے مارے اس کے گلنار رُخسار پیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے برف ایسے سپید ہاتھوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں اور مارواڑی لڑکا اپنی سونے اور ہیرے کی انگوٹھیوں میں جگمگاتی انگلیوں سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ایسی بے ساختگی سے مُسکرا رہا تھا جیسے رانی گدگدی بن کر اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ اگرچہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ رانی کے بے رس ہونٹوں اور پیلے پیلے رخساروں میں بھوک نے کڑوی نمولیوں اور کچے سیبوں کی سی تلخی اور کھٹاس پیدا کر رکھی ہے۔ مگر اس کے وئید نے اس کے لئے چالیس کنواریوں کی شرط لگا رکھی تھی ——— اور رانی کا نمبر چالیسواں تھا۔ مارواڑی لڑکے کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بار بار بنگال کے قحط اور اس کے لانے والوں کو دعائیں دے رہا تھا۔

نڈھال اور نیم جان رانی اونچے محل کی بے شمار سیڑھیاں طے کر کے نیچے آئی تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ آسمان سے دھرتی پر اتر آئی ہے ـــــ آسمان سے دھرتی۔ دھرتی سے آسمان ـــــ زندگی کی یہی دو منزلیں ہیں۔ ازل سے لیکر ابد تک! ـــــ انسان مکان و زماں کی قید سے آزاد بھی ہو گا ـــــ؟ رانی کو دیکھ کر بوڑھے ماں باپ اور گیارہ ننھے ننھے بھائی بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ باپ نے اپنا لرزتا ہوا جھریوں پڑا ہاتھ اس کے سر پہ پھیرتے ہوئے اشیرواد دی..... اشیرواد! ماں نے اپنے میلے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی بلائیں لیں.... بلائیں!

اشیرواد اور بلائیں ـــــ آج سے پہلے جب کبھی اس کے ماں باپ اس کو اشیرواد دیتے اور بلائیں لیتے تو اس کے دل میں مور ناچنے لگتا تھا ـــــ آج اس کے من کا مور مر گیا تھا۔ وہ یوں گم سی ہو گئی تھی جیسے مارواڑی لڑکا کوئی زہریلا ناگ تھا جو اسے سونگھ کر بے جان کر گیا ہو۔

ایک کان میں اس کا باپ کہہ رہا تھا ـــــ میری بچی تو بوڑھے والدین کی بڑی لڑکی ہے ـــــ دوسرے کان میں اس کی ماں کہہ رہی تھی ـــــ میری لاڈلی تو ان گیارہ ننھے بچوں کی بڑی بہن ہے۔ رانی سوچ رہی تھی کہ وہ بڑی لڑکی اور بڑی بہن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے ـــــ اس کی آنکھیں خلا میں اپنے منگیتر چندر کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ جو کلکتہ یونیورسٹی کا ایک بے روزگار گریجویٹ تھا۔ اور ایک عرصے سے نوکری کی تلاش میں کلکتے گیا ہوا تھا۔ ہر ہفتے وہ رانی کے نام کلکتے سے ایک محبت بھری چٹھی بھیجا کرتا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس کی چٹھی آئی تھی کہ وہ بہت جلد رانی سے ملنے آنیوالا ہے۔

شاید اگلے بدھ تک ـــــ رانی دل ہی دل میں کالی ماتا سے پرارتھنا کرنے لگی کہ اگلے بدھ تک وہ کسی طرح دھرتی سے اٹھ جائے ـــــ اگلا بدھ طلوع ہی نہ ہو ماتا!

بوڑھے باپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چل بیٹی ـــــ اب چلیں"

رانی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کا ہاتھ بڑی ذلت سے جھٹک دے مگر نقاہت سے وہ نیلی رگوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لئے چپ چاپ اپنی ساڑی کے پلو میں ہاتھ بڑھا کر چاندی کے پانچ سکے اپنے باپ کی ہتھیلی میں تھما دیئے ـــــ اب پورا قافلہ چلنے لگا۔ اس قافلے کی رکی ہوئی زندگیاں چلنے لگیں۔ کیا ٹانک ہوتی ہے چاندی کے سکوں میں!

ابھی یہ قافلہ ایک بجلی کے کھمبے سے دوسرے کھمبے تک بھی نہ گیا ہوگا۔ کہ ایک جانی پہچانی آواز سے وہ رک گیا۔ اس آواز سے رانی کے کانوں کے پردے تھرتھرانے لگے اس کا جسم چوٹی سے ایڑی تک کانپنے لگا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چندر کو دیکھا جو ایک میلے کوٹ اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں ملبوس بغل میں ایک چھوٹا سا بستر دبائے دوڑا دوڑا چلا آرہا تھا ـــــ آج بدھ تو نہیں تھا!

"ارے چاچا ـــــ یہ پلٹن کہاں لئے جارہے ہو۔ چاچا۔ کچھ سنا تم نے ـــــ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ تیس روپے ماہانہ۔ اب تم کو محنت مزدوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چاچا میں کماؤں گا۔ تمہیں۔ موسی کو۔ رانی کو اور ان ننھے ننھے خرگوشوں کو پالا کروں گا۔ چلو گھر چلو۔ دیکھو میں کیا کیا چیزیں لایا ہوں کلکتے سے ـــــ"

چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر قحط اور گرانی کو کوسنا شروع کیا۔ "بیٹا ـــــ کون سے گھر چلیں۔ مکان والے نے گھر سے بے دخل کر دیا ہے۔

تین مہینے سے کرایہ نہیں دے سکے تھے نا. اب تو یہ بجلی کے کھمبے ہی.....
چندر کے لال انگارہ گالوں کو بڑھیا کے جملوں نے پانی کے چھینٹوں کی طرح بجھا دیا ـــــ مگر فوراً ہی اس نے رانی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ "ارے تو کیا پرواہ ہے موسی ـــــ جب تک چندر کے جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی ہے۔ چندر اپنی موسی کے لئے (یعنی اپنی موسی کی لڑکی کے لئے) تاج محل جیسی عمارت کھڑی کر سکتا ہے ـــــ ہاں! اچھا تو موسی اسی بجلی کے کھمبے کے پاس ڈیرا لگا دو۔ پھر ـــــ مجھے تو بڑی زوروں کی بھوک لگی ہے"۔

چندر نے اپنا بستر فٹ پاتھ پر رکھ کر کھولا۔ اور اس میں سے ٹین کے دو تین ڈبے نکال کر سب کے سامنے رکھ دیئے، دیسی اور انگریزی مٹھائیوں کی ملی جلی سوندھی خوشبو سے ننھے ننھے خرگوشوں کے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ چیلوں کی طرح ان پر جھپٹ پڑے ـــــ مگر رانی گم سم ہی بیٹھی رہی۔ ماں کے اصرار پر اس نے دو ایک لقمے پانی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارے۔ چندر سوچ رہا تھا کہ یہ بھی ایک ادا ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی۔ وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے رانی کی جھکی ہوئی پلکوں اور گھنے گھنے ابروؤں کو دیکھ کر اپنے آپ پر شعریت اور رومانیت کا عالم طاری کر رہا تھا۔ کھانے سے زیادہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جب تک لڑکیاں شرماتی ہیں۔ بڑی سندر معلوم ہوتی ہیں۔ ذرا شرم دور ہوئی کہ سارا مزہ کرکرا ہو گیا ادھر رانی کے جسم پہ بار بار رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے من کا مور ابھی مرا نہیں۔ بلکہ زخموں سے چور ہو کر پھڑ پھڑا رہا ہے ـــــ دھڑک ـــــ دھڑک دھڑک.....

کھانے سے فارغ ہو کر چندر ایک سستی سی سگریٹ جلا کر ایک گونہ سکون اور سرور کے زیر اثر رانی سے کچھ باتیں کرنا۔ اس کو چھیڑنا اور ہنسانا چاہتا تھا۔ اس کو

رانی کی ہنسی بہت پسند تھی۔ وہ جب ہنستی تھی تو..... چندر کوئی بالکل انوکھی تشبیہ سوچ رہا تھا کہ ایک پولیس والے نے اپنی مونچھوں کو بھونڈا سا بل دیتے ہوئے انھیں ڈانٹا "ارے کیا یہ تمہارے باپ کی سڑک ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے ——— اٹھائی گیرے کہیں کے۔

چندر کو پولیس والے کی یہ مداخلت بڑی ناگوار معلوم ہوئی خصوصاً اس وقت جب وہ رانی کے ساتھ ایک خیالی اڑن کھٹولے میں بیٹھا اپنی بولٹوپیا کی سیر کر رہا تھا۔ اور اس کی ہنسی کے متعلق کوئی رنگین تشبیہ اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ مگر اس نے سپاہی کی مونچھوں کا بل دیکھ کر جھگڑا بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ غریبوں کے باپ بھی غریب ہوتے ہیں۔ اسی لئے ایسی صاف شفاف سڑک ان کے باپ کی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ ممکن ہے کہ ان کے باپ دادا ؤں نے یہ سڑک بنائی ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے..... تاج محل جانے کن معماروں نے بنایا تھا، مگر دنیا یہی کہتی چلی آئی ہے کہ شاہ جہاں نے بنایا ہے تاج محل۔

"ابے او بڈھے ——— سنتا ہے کہ نہیں ——— لے چلوں تھانے ——؟" بوڑھا اٹھ کر سپاہی کی خوشامد کرنے لگا۔ "سرکار ——— آج ایک رات بسر کرلینے دو کل سویرے ہی چلے جائیں گے۔ قحط کے مارے ہیں۔ سرکار تو مائی باپ ہے۔ دیا کرو ہم پر ———"

چندر کو بوڑھے کی اس رجعت پسند ذہنیت پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر سرکار مائی باپ ہے تو بیشک یہ سڑک بھی ہمارے باپ کی ہے۔ مگر دنیا ابھی تک رجعت پسندی اور مونچھوں کے بل میں پھنسی ہوئی ہے۔ پھر کیا فائدہ ایسی تاویلات سے" اس نے جیب سے ایک چونّی نکال کر رانی کو دکھاتے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں رکھ دی۔ دراصل چندر رانی کو مرعوب کرنا چاہتا تھا کہ رانی کا راجہ

کلکتے سے سچ مچ کا راجہ بن کر لوٹا ہے۔

سپاہی مسکراتے ہوئے آگے نکل گیا اور بوڑھا بڑبڑانے لگا۔

"اِتّی بڑی دھرتی ——— اور ہمارے باپ نے ہمارے لئے چپہ بھر زمین بھی ورثے میں نہیں چھوڑی۔" اور بوڑھے نے اپنے باپ کو ایک خوفناک گالی دی۔

چندر نے بوڑھے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چاچا ——— کچھ غم نہ کرو۔ ظلم کی چکّی سدا چل سکتی نہیں۔ ایک نہ ایک دن تو اسے رکنا ہی پڑے گا۔ اب تو اپنے دیس میں اشتراکیت....

معًا چندر چونک پڑا کہ وہ جانوروں کے آگے بین بجا رہا ہے۔ یہ بوڑھے کیا جانیں دیس کیا ہوتا ہے اور اشتراکیت کسے کہتے ہیں۔ ان کی تو جتنی کھوپڑی ہے اتنا دماغ ہے، اس وقت اس نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "رانی ——— بھگوان نے چاہا تو ہماری اولاد کچھ کر دکھائیگی ——— کیوں ———؟"

چندر آنے والی نسل کے بارے میں پکار رہا تھا۔ اسی لئے ابھی سے بے فکر ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بوڑھے سے کہا۔ چاچا ——— کوئی فکر کی بات نہیں۔ اندھیری رات کے بعد صبح ضرور ہوگی۔ میرے پاس اس وقت سترہ اٹھارہ روپے ہیں۔ کل سویرے ہی کلکتہ چلیں گے ———"

اور پھر اس نے شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "اور وہاں ——— وہاں" بوڑھا چندر کا مطلب سمجھ گیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس میں جواب دیا۔ "بیٹا ——— "بھگوان تمہیں سکھی رکھے ———!"

* * * *

دوسرے دن بھوکوں کا یہ قافلہ کلکتے پہنچا۔ چندر نے اڑوس پڑوس کے

لوگوں اور شناساؤں کو بتایا کہ وہ اپنی رانی کو کلکتے لے آیا ہے۔ اپنے خاص خاص دوستوں کو ایک گھٹیا سے ہوٹل میں ایک چھوٹی سی ٹی پارٹی بھی دی۔

کلکتے پہنچ جانے کے بعد بوڑھے، بڑھیا اور ننھے خرگوشوں کے پیٹ میں بھوک کے شعلوں کی پہلی سی غضبناکی نہ رہی تھی۔ البتہ رانی اسی طرح گم سم ہی تھی جیسے مارواڑی عفریت کا زہر ابھی تک اس کی روح میں رچا ہوا ہے۔ چندر کو بعض اوقات حیرت ہوتی اور وہ اس پتھر کی مورتی کو دیکھ دیکھ کر بقول خود "فنڈاپ" ہو جاتا تھا۔ مگر انسان اپنے آپ کو بھلا بھی تو لیتا ہے۔ ارے یوں ہی ہوتا آیا ہے۔ ہر ہندوستانی لڑکی اپنے دولھا کو دیکھ کر منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیتی ہے۔ خیر شادی ہو لینے دو۔ پھر دیکھنا رانی صاحبہ کی اتنی سی زبان میرٹھ کی قینچی کی تک کو مات نہ کر دے میرا نام چندر نہیں۔

ایک دن برسبیل تذکرہ اپنے ایک بڑے عزیز دوست سے رانی کے متعلق کہہ ہی دیا کہ وہ لڑکی نہیں ممّی ہے ممّی ——!

اس دوست نے اپنا تجربہ بتاتے ہوئے اس کا شک دور کیا کہ بھئی —— شادی سے پہلے ہر ہندستانی لڑکی ممّی ہی ہوتی ہے۔ اب ہماری شریمتی ہی کو دیکھو۔ شادی کے بعد پورے آٹھ دن تک ہزار آفتوں اور لاکھ خوشامدوں کے باوجود ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ "آٹو چینج اور آٹو ریلیز گراما فون" کی طرح دن بھر بجتی رہتی ہے۔ کہاں رہتے ہو —— گھر کی بھی کوئی فکر ہے تمہیں —— پیسے نہیں رہے۔ چاول ختم ہو گئے —— موئے جاپانیوں کو کالی ماتا نگل لے —— جب سے برما پر قبضہ کیا ہے ..... اور یہاں سے وہ ساری بین الاقوامی سیاسیات پر لکچر دینے لگتی ہے۔ بھلا سوچو تو۔ کہاں عورت کی زبان کی شیرینی اور کہاں اٹلانٹک چارٹر کی کڑوی دفعات۔ بڑی پرل بک بنی پھرتی ہے —— ارے عورت کی زبان کو تو ہارمونیم کی پتی ہونا چاہیئے —— ذرا چھوا —— اور روح کے ریگ زار میں مدھ کا

سیلاب بہا نہیں. بعض اوقات میں تو یا لکل تنگ آجاتا ہوں۔ تم بھگوان کا شکریہ ادا کرو کہ تمہیں میری طرح تعلیم یافتہ بیوی نہیں ملی۔"

چندر مسکرا دیا۔ اس کو تعلیم یافتہ عورتوں سے چڑ تھی۔

غرض عورتوں کی اس جماعت کے بارے میں وہ خالص رجعت پسند اور خود غرض تھا۔ تھرڈ کلاس گریجویٹ تھا۔ اسی لئے تعلیم یافتہ عورت سے شادی کر کے اپنے آپ کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے بی۔ اے صرف اس لئے کیا تھا کہ بی۔ اے کی ڈگری قابلیت کی سند سے زیادہ دنیا کے بازار کی ایک جنس ہے۔ موجودہ تعلیم کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ ہم ۵، فی صدی علم کے بجائے ۵، فی صدی حاضری کے لئے کالج جایا کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ اس کی رانی تعلیم یافتہ عورت کی طرح دردِ سر نہیں بلکہ دردِ جگر ہے۔

چندر کو اب رانی کی ٹھیری ہوئی جوانی پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ بعض اوقات وہ "فنڈاپ" ضرور ہو جاتا تھا کہ عجیب لڑکی ہے۔ کبھی چوری چھپے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی نہیں بہلاتی ——— اور یہ بڑھیا تو آٹھوں پہر رانی سے چڑیل کی طرح لپٹی رہتی ہے۔ کبھی رانی کو تنہا نہیں چھوڑا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ کہیں رانی کو اس کی نوکری کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا!

چندر کی نوکری ایک راز ہی تو تھی۔ دن بھر پاؤں پھیلائے کھاٹ پر پڑا خرّاٹے لیتا رہتا اور سرِ شام ہی کھانا کھا کر اپنا اکلوتا کوٹ کندھے پر ڈال ڈکاریں لیتا باہر چلا جاتا۔ اور رات کے تین چار بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتا۔ چندر اپنی نوکری کے متعلق کسی کو بتاتا بھی تو کیسے ——— ؟ بتانے والی بات ہوتی تو بتا بھی دیتا۔ سیٹھ نے بنگال کے قحط سے فائدہ اٹھا کر خفیہ طور پر بھوکی عورتوں کی تجارت شروع کر دی تھی اور اس تجارت میں چندر سیٹھ کا بہ حیثیت ایک کمیشن ایجنٹ معاون تھا۔ اس نے

اب تک کوئی تین ساڑھے تین سو کنواری، بیاہی، ادھیڑ، کالی، گوری، موٹی، دُبلی، خوبصورت بدصورت ——— عورتوں کو سیٹھ کے ہاتھ معقول کمیشن پر بیچا تھا ——— کیا رانی کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی ——— ؟ رانی کے دل کی طرح چندر کے دل میں بھی چور تھا۔

ایک رات چندر اپنی نوکری پہ جانے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ رانی کو قے ہوئی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اس نے دو تین بار استفراغ کیا۔ اور چندر گھبرا گیا۔ بوڑھے بڑھیا کے منع کرنے کے باوجود وہ دوڑا دوڑا ایک سستے سے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے رانی کا معائنہ کیا اور مسکرایا۔ چندر کی پیٹھ کو تھپکاتے ہوئے کہنے لگا "بابو۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے"۔

خوش ہونا چاہیئے ——— ! چندر حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ سچ مچ ڈاکٹر ہے یا صرف ڈاکٹر کی والدی..... ڈاکٹر نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ "تمہاری وائف ——— ایک بچّہ کی ———"

چندر کو یوں محسوس ہوا جیسے دھرتی ایک زبردست زلزلے سے لرز اٹھی ہے اور وہ تمام ناجائز بچّے جن کی ماؤں کو چندر نے معقول کمیشن پر سیٹھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ چیختی ہوئی چٹانوں کے ریزے چن چن کر بے تحاشا قہقہے لگاتے ہوئے چندر پہ پھینک رہے ہیں۔ یہ بچّے ——— یہ آنے والی نسل ——— جن کے بارے میں چندر پیکارِ جائی تھا۔

چندر نے لڑکھڑا کر قریب کے ستون کا سہارا لیا ——— اور جب وہ آہستہ آہستہ آدمی کی جون میں آنے لگا تو رانی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر یکایک مسکراہٹ آگئی ——— آخر وہ اور کیا کرتا! اس کے پاس آنسو کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے اپنے گلے کے پھندے کو کھولتے ہوئے کہا۔ "اچھا ——— تو رانی ——— ایک بچّے کی ———"

اور وہ اپنے اکلوتے کوٹ کو کندھے پہ ڈال کر آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ اور پھیلے ہوئے گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا ـــــ غائب ہو گیا..... فنا ہو گیا۔

باہر نکلتے وقت اس نے رانی کی ایک ہلکی سی ڈراؤنی چیخ بھی سُنی۔ مگر اب وہ رانی سے اتنی دور جانا چاہتا تھا کہ وہ ہلکا لطیف تار جس نے چندر کے دل کو رانی کے دل سے باندھ رکھا تھا۔ کھینچتے کھینچتے بالآخر ٹوٹ جائے ـــــ ایسا ٹوٹے کہ پھر کبھی نہ جڑ سکے ـــــ مگر وہ اس تار کو جتنا کھینچتا تھا۔ وہ اتنا ہی کھنچتا چلا چلا جا رہا تھا۔ اگر چندر دھرتی کے آخری کنارے کو بھی پھلانگ جاتا تو بھی وہ تار نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

* * * *

چند مہینے گزر گئے۔ نہ چندر کہیں دکھائی دیا اور نہ رانی کا حال معلوم ہو سکا بنگال کا قحط اسی طرح زوروں پر رہا۔ ہزاروں رانیوں کے بچے پیدا ہوتے رہے اور ہزاروں چندر اندھیرے میں ڈوبتے گئے۔ غائب ہوتے گئے فنا ہوتے گئے۔

ایک دن ذکریا اسٹریٹ میں سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کو اٹھانے والی بیل گاڑی چرخ چوں..... چرخ چوں کرتی آ رہی تھی۔ اور فٹ پاتھ پر ایک دکھیا بھکارن بھوکی عورت سکرات کے عالم میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کی سوکھی چھاتی کو ایک ننھا بچہ چوستے چوستے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ گاڑی بان جب بچے کی لاش کو اٹھانے کے لئے جھکا تو یکایک اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس بچے کی ماں فٹ پاتھ پر پڑی ڈراؤنی آواز میں کراہ رہی تھی

"چندر ـــــ آں ـــ ہا ـــــ چن ـــــ در ـــــ آہاں۔"

گاڑی بان نے جھک کر اس ہڈیوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ وہ چندر کی

نظریں عورت کی آنکھوں کے دھنسے ہوئے گڑھوں میں ڈوبتی گئیں۔ اور وہ بے اختیار ہو کر گھٹنوں کے بل اس پر گر پڑا۔ اس کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈی کے نیچے دھنسے ہوئے گڑھے میں اپنی تھوتھنی گاڑتے ہوئے وہ گڑگڑانے لگا "میری رانی ـــــ میری دلھن ـــــ میری جان۔"

اور بس گاڑی بان کی آواز سن کر ذکریا اسٹریٹ کو بھیانک چیخوں سے گونجاتے ہوئے انسانی کیڑوں کے ایک اور ڈھیر کی طرف رینگنے لگے!

—+—

حفیظؔ ہوشیارپوری

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں!

مرنا بھی مشکل ان کو جینے کا بھی امکاں نہیں
چلتی پھرتی لاشوں کے سائے ہیں یہ انساں نہیں
موت کی جانب رقصاں ہیں یہ چلتے پھرتے سائے
یا کچھ بھوت ہیں موت کی وادی سے دنیا میں آئے

سانسوں پر بھی زنجیریں تھیں، یہ زنجیریں ٹوٹ گئیں
دُکھ کے بندھن ٹوٹ گئے یا بھوک سے نبضیں چھوٹ گئیں
دھن والوں تک اس بپتا کی کون خبر پہنچائے
بازاروں میں بیچ رہے ہیں بہنوں کو ماں جائے

مر مر کر جینے والوں کا، جاں سے گذرنا دیکھ لیا!
سارے جگ کے ان داتا کا بھوک سے مرنا دیکھ لیا!
خود بھوکوں مر جائے جگ کا ان داتا کہلائے
ختم بھی ہو اے دورِ غلامی ہم سے جیا نہ جائے

کلپنادت

تنگ و ناموس خطرے میں

اپنی ماؤں اور بہنوں کی دردناک کہانی میں کس منہ سے
بیان کروں۔ میں نے ارکان روڈ پر جو شرم ناک منظر اپنی آنکھوں
سے دیکھے۔ اُنھیں کاغذی پیرہن کس طرح پہناؤں۔ دس میل کے
سفر میں میں نے اپنی صدیوں کی پُرانی تہذیب کی جو کراہ سنی۔ وہ
اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ سماج کی بے رحمی،
خود غرضی اور نفس پرستی نے عورت کو اخلاقی پستی کے جس غار میں
ڈھکیل دیا ہے۔ اُس سے ایک زہریلا دھنواں اٹھ رہا ہے۔ اتنا
زہریلا کہ اگر قوم نے جلد خبر نہ لی تو ساری فضا اس سے بھر جائیگی۔
سڑک کے کنارے کے درخت گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ فوجی موٹریں اور
ٹھیکہ داروں کی بسیں مسلسل آجا رہی تھیں۔ اتنے میں دور سے ایک موٹا تازہ آدمی
گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اُسے پہچاننا مشکل نہ تھا۔ وہ سلک کی شلوار پہنے
ہوئے تھا۔ دسوں انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں ہم نے اسے
گھورنا شروع کیا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نظروں سے غائب ہو گیا
وہ ٹھیکے دار تھا۔ یہ وہ جنس ہے جو مہذب انسانیت کی تیز نظروں کی تاب نہیں لا سکتی۔
غیر فوجی راہگیر اس سڑک پر بہت کم گزرتے ہیں۔ پھر بھی آپ کو یہاں درجنوں

عورتیں نظر آئیں گی۔ کوئی مٹی کھود رہی ہوگی۔ کوئی سڑک پر چھڑکاؤ کر رہی ہوگی۔ یہ عورتیں معمولی عورتیں نہیں ہیں۔ وہ یہاں کے لیبر کور (فوجی مزدوروں کا دستہ) میں ملازم ہیں۔ دس بارہ کی ایک ٹولی ہوتی ہے۔ ان کا ایک سردار ہوتا ہے۔ کبھی عورت کبھی مرد۔ اسے مانجھی کہتے ہیں۔

انھیں دیکھتے ہی محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ غیر معمولی عورتیں ہیں۔ ان کی سج دھج ان کی بات چیت سب الگ ہوتی ہے۔ پھولے پھولے چہرے اوہ.... اور آنکھوں میں خاص قسم کی درشتی۔ ان میں نوجوان بھی ہیں اور ادھیڑ بھی۔ ان کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، نہ کوئی اور ذریعۂ معاش۔ قحط نے ان کا گھر اُجاڑ دیا۔ اُن کے شوہر اور بچّوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آس پاس کے گاؤں والے کہتے ہیں کہ لیبر کور کی عورتیں قحبہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی پاک دامن عورت ان میں پہنچ جاتی ہے تو بپت کے وقت اسے بھی مجبوراً اپنا جسم ہی بیچنا پڑتا ہے۔ ان باتوں کی تصدیق بہت جلد ہو گئی۔ ہم لوگ لیبر کور کی جس عورت سے ملے اُس نے یہی شکایت کی کہ اُسے اُجرت وقت پر نہیں ملتی۔ دس پندرہ دن کی محنت کے بعد بہت ملا تو ایک یا دو روپیہ۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کے لباس دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کسی ایک عورت کے بھی کپڑے پھٹے نہ تھے اور نہ اُن کے چہرے سے فاقوں کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ پھر ان کا بناؤ سنگار، اُن کی نیم عریاں پوشاکیں، اور مردوں کو لبھانے کی خاطر ٹھاٹھ باٹھ میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی شرمناک کوشش۔ یہ چیزیں اس سے پہلے بنگال کے گاؤں میں اور گھریلو عورتوں میں کسی نے دیکھی ہیں؟ اس سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی آمدنی کے کچھ اور ہی ذریعے ہیں۔

ان کے کام کے اوقات آٹھ بجے صبح سے پانچ بجے شام تک ہیں۔ قاعدے سے انھیں کام کے بعد گھر چلا جانا چاہیئے۔ پھر ارکان روڈ ایسی سڑک بھی نہیں کہ عورتیں

شام کے وقت آزادی سے اس پر چل پھر سکیں، پھر بھی عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ شام کے وقت ارکان روڈ کے دونوں طرف بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اُس دن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک موٹر مزدور عورتوں کے ایک جھنڈ کے پاس رُکی۔ بس میں سے ایک آدمی نے جو خاکی وردی پہنے ہوئے تھا ایک جوڑا جوتا اور ایک ساری ان کی طرف پھینکا ابھی بعض عورتیں اُس تحفے کو اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں کہ موٹر بس والوں کو کسی افسر کی کار کی آواز سنائی دی اور وہ چل دیئے۔

اس وقت مجھے تین مہینے پیچھے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں امیر آباد گئی تھی۔ وہاں میں نے سنا تھا کہ کوئی شخص ایک عورت کو ارکان روڈ پر دن دہاڑے موٹر بس میں اٹھا لے گیا تھا۔ عورت نے اپنی آبرو بچانے کے لئے اسے دانت بھی کاٹے تھے پھر وہ دو میل کے فاصلے پر پائی گئی تھی۔ اس کا سارا جسم لہولہان تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اس واقعے نے گاؤں کے لوگوں میں ذرّہ برابر ہلچل نہیں پیدا کی تھی۔ اُس گاؤں میں میں نے ایک نوجوان بیوہ کی دُکھ بھری کہانی سنی تھی۔ اس کا نام سرلا تھا۔ اُس نے مجھ سے خود بیان کیا تھا۔

ایک شام کو میں اپنے سات آٹھ سال کے بچّے کے ساتھ ارکان روڈ سے گزر رہی تھی۔ اتنے میں ایک حبشی اپنی موٹر سے کودا اور مجھے زبردستی اٹھا لے گیا۔ بس میں اس کے اور بھی کئی ساتھی تھے۔ جس وقت بس دو ہزاری میں پہنچی تو کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ سپاہیوں نے مجھے بس میں بند کر کے تالا ڈال دیا۔ اور خود کھانا کھانے چلے گئے۔ میں نے لاکھ شور مچایا، دروازہ پیٹا۔ لیکن شنوائی نہیں ہوئی۔ اچانک میری نظر ایک سوراخ پر پڑی۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے وہاں کا تختہ سرکایا پھر اپنے کپڑے اتارے۔ کیونکہ سوراخ سے کپڑا پہن کر نکلنے کی گنجائش نہ تھی۔ بس سے نکل کر میں ننگی بھاگی۔ سارے راستے میں نے کپڑا نہیں پہنا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ مبادا اندھیری میں

میری سفید ساری چمکے اور یہ موذی سپاہی مجھے دیکھ لیں۔ لیکن دوسرے دن مجھے پھر اُسی لیبر کور میں کام کرنے جانا پڑا۔" سرلا اپنے لڑکے کے علاوہ ایک یتیم لڑکی کو بھی پال رہی تھی۔ یہ لڑکی ایک دن اُسے سڑک پر پڑی مل گئی تھی۔ اور سرلا اسے اٹھا لائی تھی۔ ماں کی ممتا نے اس میں اپنی آبرو بچانے کا پاک جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ظالم سماج نے اس کو اتنا بھی سہارا نہ دیا کہ وہ محنت کر کے اپنی عزت بچا لیتی۔ آج اسی ممتا کی بدولت اسے اپنا جسم بھی بیچنا پڑ رہا ہے۔

اسی امیر آباد کی ایک اور لڑکی تھی ماجدہ۔ اس کی عمر مشکل سے اکیس سال ہو گی۔ وہ بھی اپنی عزت کو عزیز رکھتی تھی۔ اس کا شوہر ایک غریب کسان تھا۔ قحط کے زمانے میں وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور فینی میں رہنے لگا تھا۔ وہاں اُسے گٹھیا ہو گئی۔ اور وہ کام کرنے سے معذور ہو گیا۔ جب لنگر خانے اور کام گھر اور پیٹ پالنے کے دوسرے تمام ذرائع مسدود ہو گئے۔ تو ماجدہ کو مجبوراً لیبر کور میں شامل ہونا پڑا۔ لیکن وہاں تو روپے کی خاطر عصمت بیچنی پڑتی۔ اس لئے وہ لیبر کور کو چھوڑ کر چلی آئی۔ اور اپنے ساتھ دس پندرہ اور عورتوں کو بھی اس لعنتی جگہ سے نکال لائی۔ ان سبھوں نے قسم کھائی کہ اب کبھی لیبر کور میں شامل نہ ہوں گے۔

ابھی چند دن ہوئے میں دوبارہ امیر آباد گئی تھی۔ اور ماجدہ سے دوبارہ ملی تھی۔ لیکن اب کی وہ بستر موت پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا مر چکا تھا۔ اس نے رو رو کر مجھے بتایا کہ وہ اپنی قسم پر قائم نہ رہ سکی۔ پیٹ کی مار اُسے دوبارہ لیبر کور میں لے گئی۔

شرافت اور انسانیت کا خون ارکان روڈ پر چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا گویا میں کسی قدیم تہذیب کے کھنڈروں کی سیر کر رہی ہوں اور اس کھنڈر کے نیچے اس تہذیب کی تمام شاندار روایتیں دفن ہیں۔ ہمدردی، شرافت، شفقت، محبت،

بھائی چارہ اور انسانیت آج یہ تمام خوبیاں ہم میں سے ایک سرے سے غائب ہیں قوم کو اس زبردست تباہی سے بچانے کے لئے ماجدہ اور سرلا جیسی عورتوں نے اپنے کمزور جسموں کے باوجود کافی جدوجہد کی۔ لیکن اُن کے عزم وارادے کی نازک کشتی قوم کی بے غیرتی اور بے حسی کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔

سڑک پر میں نے لیبر کور کی بہت سی عورتوں سے بات کی۔ سب کی سب اپنی معصومیت اور پاکدامنی کی قسم کھاتی ہیں۔ البتہ وہ دور کھڑی ہوئی عورتوں کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ دیکھو وہ قحبائیں ہیں۔ میں نے دو ایک سے پوچھا "کیا تم لوگ فوجی کیمپوں میں بھی جاتی ہو؟" ایک عورت نے جواب دیا۔ "نہیں بہن کبھی نہیں۔ اُن کالے کالے دیوؤں سے بڑا ڈر لگتا ہے؟" خود امینہ نے جو لیبر کور کی مانجھی ہے حبشیوں کے بارے میں یہی رائے ظاہر کی۔ اس علاقے کا ہر شخص اس عورت کے کارناموں سے واقف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ٹھیکے دار کی داشتہ تھی۔ ٹھیکے دار اُس کے جسم اور خوبصورتی کا سودا کر کے ٹھیکے حاصل کیا کرتا تھا۔ پھر ایک انگریز نے اس سے شادی کر لی۔ تھوڑے عرصے تک لطف اٹھانے کے بعد وہ بھی امینہ کو چھوڑ کر چل دیا۔ اب وہ ہر شخص کی منظور نظر ہے۔ وہ کھلّم کھلا سڑک پر ٹھیکہ داروں سے یارانہ جتاتی ہے اور ان کے ملازموں پر حکومت کرتی ہے۔ اس کی بدمعاشیاں اتنی بڑھیں کہ دو مہینے گزرے حکّام نے ایک آرڈر نکالا کہ امیر آباد کی کسی عورت کو لیبر کور میں نہیں لیا جائے گا۔ امینہ کو حکم ملا کہ وہ اس علاقے سے چلی جائے۔ نہ جانے وہ اب کہاں ہے؟

لیبر کور بھی توڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اس میں کام کرنے والی عورتوں کے لئے روزی کمانے کا کوئی اور انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ گاؤں والے بھی ان کی فکر نہیں کرتے۔ چنانچہ بعض دکھن کی طرف چلی گئی ہیں۔ بعض گھر گھر بھیک مانگ رہی ہیں اور

بقیہ کے لئے جسم فروشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ گاؤں کے دلّال ان کی اس بے بسی سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ڈپو میں کام کرنے والی عورتیں بھی اس آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ڈپو میں عام طور پر متوسط طبقے کی عورتیں کام کرتی ہیں۔ وہ کپڑے سیتی ہیں۔ یا اسی قسم کے دوسرے کام کرتی ہیں لیکن وہ بھی جسم فروشی کی لعنت سے نہیں بچ سکی ہیں۔ کئی مہینے ہوئے میں نے تیری بازار کے متوسط طبقے کے ایک گھرانے کا حال سنا۔ یہ قصّہ خود اس گھر کی بہو نے مجھے سُنایا۔ اس کا دیور رنگون میں تھا۔ اس کی بیٹی اور بیوی تیری بازار میں تھیں۔ شروع شروع میں انھیں برماریلیف کمیٹی کی طرف سے کچھ روپے مل جاتے تھے۔ لیکن بعد میں آمدنی کا یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ لڑکی کی شادی شہر کے ایک لڑکے سے ہونے والی تھی۔ لیکن پنڈتوں کی عنایت سے زائچہ نہیں ملا۔ اس لئے شادی نہ ہو سکی۔ آخر مجبور ہو کر ماں بیٹی دونوں نے فوجی ڈپو میں نوکری کر لی۔ وہ روز شہر آتیں پوجا کے دنوں میں گاؤں والوں نے دیکھا کہ ایک شخص روز رات کو وہاں آتا ہے ایک دن انھوں نے اسے پکڑا تو اُس نے کہا "میں نے لڑکی سے شادی کر لی ہے"۔ جس عورت نے مجھے یہ قصّہ سنایا وہ اپنی سسرال سے میکے چلی آئی ہے۔ کیونکہ اس سے سسرال والوں کی یہ بے شرمی اور بے حیائی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اُس نے کہا کہ اس کی بھاوج نے گاؤں کی کئی لڑکیوں کو اسی راستے لگا دیا ہے۔

چٹ گاؤں کی عورتوں میں جسم فروشی کی یہ وبا صرف روٹی نہ ملنے کی وجہ سے نہیں پھیلی ہے۔ بلکہ اس میں نفس پرستی اور دولت کا بھی ہاتھ ہے۔ آج چٹگاؤں کا، کوئی ایک طبقہ، کوئی ایک فرقہ اس عذاب میں مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ پوری سماج اس کی شکار ہے۔ سب میں یہی زہر پھیل گیا ہے۔

پہاڑ تلی کے گاؤں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں کی بہت سی عورتیں اسٹیشن پر

ریلوے ویگنوں میں، اینٹ کے بھٹوں میں اور ایسی ہی جگھوں میں بیٹھی گاہکوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ کئی مہینے گزرے بھوانی سین، بنگال کمیونسٹ پارٹی کے سکرٹری نے اس علاقے کی پُر از معصیت زندگی پر ایک مضمون لکھا تھا اور مقامی لوگوں نے اسے پڑھ کر کہا تھا کہ بھوانی بابو کا مضمون بہت مختصر ہے۔ یہاں کی زندگی پر تبصرہ کرنے کے لئے تو دفتر کے دفتر چاہئیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری اس شرمناک زندگی کو اخباروں کے ذریعے تشہیر کرنے کی کیا ضرورت تھی بھوانی بابو کی ہمت افزائی سے موضع کتھولی کے لوگوں نے چندہ جمع کیا تھا اور حکومت کو مجبور کیا تھا کہ وہ ماہی گیروں کے ۴۵ جھونپڑے بنانے میں گاؤں والوں کی مدد کرے۔ آج کتھولی میں زندگی کے آثار دوبارہ نظر آ رہے ہیں۔ اب تک ایسی تیرہ عورتوں کو پناہ دی جا چکی ہے۔ وہ مجبور ہو کر جسم فروشی کرنے لگی تھیں لیکن ان کے لئے کام مہیا کرنا اور انھیں دوبارہ گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں میں لگانا آسان نہیں ہے۔ کامریڈ بیمل دے اور ان کے ساتھی بڑی مشکل سے اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

عصمت فروشی کے خلاف عوام کی مہم

پہاڑ تلی کے کسانوں نے بھی آخر کار اپنے گاؤں کو معصیتوں سے پاک کرنے کا عزم کر لیا۔ سب سے بڑی لعنت تاڑی کی دوکان تھی جو تمام بیہودگیوں کا مرکز بن گئی تھی۔ اس کو ہٹوانے کے لئے جب درخواست دینے کا وقت آیا تو صرف دو سو آدمیوں نے دستخط کئے۔ لوگوں کی اس ہچکچاہٹ اور بے حسی کی خبر ملتے ہی دوکان والے شیر ہو گئے! ان کے غنڈوں نے دو بار پارٹی کے دفتر پر دھاوا کیا۔ اس کا اثر کارکنوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ ایک صاحب تو ڈر کے مارے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن دو چار کی پست ہمتی یوں تحریک کو دبا نہ سکی۔ کامریڈ مکھرجی کی رہنمائی میں ایک ہفتے تک مسلسل مہم چلائی گئی۔ ۳۲ آدمیوں کی ایک کمیٹی

بنائی گئی جس کا کام گاؤں سے تمام خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ جلد ہی ایک ہزار دستخط حاصل کئے گئے اور کمیٹی کے کام کے لئے دو سو روپیہ بھی جمع ہو گیا۔ کمیٹی نے تاڑی کی دوکان والوں اور قحبہ خانوں کو نوٹس دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اپنا کاروبار سمیٹ لیں ورنہ پولیس کو اطلاع دی جائے گی۔ کمیٹی کے بعض ممبروں کو شبہ تھا کہ نہ جانے یہ لوگ کمیٹی کی بات سنتے ہیں کہ نہیں۔ لیکن ۲۴ گھنٹے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ پندرہ کے پندرہ قحبہ خانے بند ہو چکے ہیں۔ اس کمیٹی کے لوگوں میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد ۳۲ آدمیوں کی ایک والنٹیروں کی ٹولی بنائی گئی جس کا کام اس علاقے میں جسم فروشی کرنے والوں کی رپورٹ تیار کرنا، دلالوں کی شرارتوں سے کمیٹی کو آگاہ کرنا۔ اور ہر ایک پاڑے (گاؤں) کی کڑی نگرانی کرنا تھا۔ لوگوں کی اس مستعدی سے چیگاؤں والوں نے بھی سبق لیا ہے۔ وہاں بھی ایک کمیٹی بنی ہے۔ لیکن بدمعاشیوں کے خلاف ابھی تک کوئی عام تحریک نہیں چل سکی ہے۔ شہریوں میں ابھی تک یہ احساس نہیں پیدا ہو سکا ہے کہ صرف کمیٹی بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ عملی قدم اٹھانا پڑیگا ہم نے اپنے ذاتی وقار قومی عزت اور حبّ الوطنی کی طرف سے کافی غفلت برتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم ان معصیتوں کے خلاف ایک آواز ہو کر اٹھیں۔ ان کا مقابلہ کریں اور ایسی سوسائٹی بنائیں، ایسے گھر آباد کریں جن میں نہ قحط ہو نہ مردوں کے مظالم ہوں اور نہ بھوک کے باعث عورتیں جسم فروشی کرتی ہوں۔

—— ✣ ——

اختر عادل (علیگ)

بنگال

(۱)

ہاہاکار مچا ہے اس جا جس کا گونجے ڈھول
جس نے موتی رولے اس کے ہاتھ میں ہے کشکول
لاج پہ مرنے والوں کی اب لاج ہے سستے مول
سنکٹ یگ نے جیون میں ڈالے ہیں گہرے جھول

(۲)

جاپانی طیارے سے دن رات برساتے ہیں آگ
گودا موں پر بنیئے بن بیٹھے ہیں کالے ناگ
جعفر پاپی جاگ اٹھا ہے سوئے ماں کے بھاگ
اپنے پیارے دیش میں بھائی آگ لگی ہے آگ

(۳)

مکھے چین سے روٹی کھائے بھوکے مر گئے داس
ڈگر ڈگر نیرنگی لاشیں سکڑ رہا ہے ماس
بھوکے بچے سسک رہے ہیں کوئی نہیں ہے پاس
دیکھ رہے ہیں مکھے سب کچھ پھر بھی نہیں وشواش

(۴)

بھوکے پیٹ دکھائے اپنا بنیئے گا نچے ناچ
گھر کی رانی ستی ساوتری بیچ رہی ہے لاج
عزت عصمت شکتی ہستی سب کچھ ہے تاراج
پیاری دھرتی پر پھیلا ہے موت مرن کا راج

(۵)

جڑ سے سوکھ رہی ہے انسانوں کی سوکھی بیل
اپنی قسمت کھیل رہی ہے جیَن مرن کا کھیل
جنتا کے سُکھ دایک نیتا بھگت رہے ہیں جیل
اپنے جلتے دیش پہ دشمن چھڑک رہے ہیں تیل

(۶)

آج ہمارا دیش دُکھی ہے بھوکا ہے بنگال
موت نے ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ کھڈے کھودے ڈالے جال
ہائے ان میں جھونکے جائیں دُکھیا ماں کے لال
اب بھی اٹھ جا نیند کے ماتے گرتا دیش سنبھال

دیوندر ناتھ ستیارتھی

نئے دھان سے پہلے

یہ کنگلوں کی قطار تھی۔ ہو بہو کمان کی طرح۔ ایک دوسرے کے متوازی کہیں سات آدمی کھڑے تھے تو کہیں دس۔ عورتیں اور بچے اور مرد۔ جوان اور بوڑھے۔ سبھی ایک ترازو میں تُل رہے تھے۔ سبھی بھوکے تھے۔ ننھے بچے خشک چھاتیوں کو چچوڑ رہے تھے۔ بڑی عمر کے بچے قطار سے نکل کر لنگر کے دروازے پر پہنچنے کے لئے ضد کر رہے تھے۔ لنگر والوں نے لاکھ کوشش کی کہ عورتوں اور مردوں کی الگ الگ قطاریں بن جائیں۔ لیکن یہ بھاری بھرکم کمان اپنی بات پر اڑی رہی۔

قطار میں کھڑے کھڑے لفظ "ست جگ" جے شری کے ذہن میں گونج اٹھا جانے ست جگ کب آئے گا۔ جانے آئے گا بھی یا نہیں، ست جگ ترتیا، دواپر، کلجگ اور کلجگ کے بعد پھر ست جگ آتا ہے۔ ست جگ کتنے برس کا ہوتا ہے، کچھ معلوم نہیں، کلجگ کی عمر بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ ہاں یاد ہے۔ ترتیا بارہ لاکھ چھیانوے ہزار برس کا ہوتا ہے۔ اور دواپر آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار برس کا۔ پنڈت تو شاستر اور پوران پڑھتا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ کلجگ کی عمر شاستر بھی نہیں جانتے۔ جانے کلجگ کا انت ہوگا بھی یا نہیں۔ شاید کلجگ ترتیا سے بھی بڑا ہو۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ یہی سنتی آئی ہوں کہ پاپ کی نیا بھر چکی ہے اور اب یہ ڈوبی کہ ڈوبی۔

اُس کے ذہن میں اَن گنت گدھ منڈلانے لگے۔ یہ سب گدھ اس پر جھپٹنے کی کوشش میں تھے۔ اُس نے سوچا۔ ست جُگ اب آئے نہ آئے یہ گدھ تو ہم کنگلوں کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ ہم بچ نہیں سکتے۔ سب سہے جا رہے ہیں۔ جیسے سب کو گدھ نظر آ رہے ہوں۔ راکھال اس کا ہاتھ کھینچے ہوئے "ماں بھوک ـــــ ماں بھوک" کی رٹ لگا رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اُس کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتا۔ لیکن اب اس کے جسم میں اتنی طاقت نہ تھی۔

جے شری نے راکھال کی گردن تھپتھپاتے ہوئے سوچا۔ "آٹھ سال سے میں اسے پالتی آئی ہوں۔ ارے ارے اس کا پیٹ تو کُپّا ہو رہا ہے۔ کس طرح ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں مزدوری تلاش کر لیتا لنگر کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہو۔ جب کہیں تھوڑا دال بھات نصیب ہوتا ہے آخر ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟..... اُس کے ذہن میں بھوکے گدھ برابر منڈلاتے رہے۔ یہ گدھ جو راکھال پر بھی جھپٹنا چاہتے تھے۔

راکھال نے ماں کا ہاتھ کھینچتے ہوئے پوچھا۔ "ہمیں دال بھات کب ملے گا ـــــ گرم گرم دال بھات؟"

"ہماری باری تو آنے دے راکھال!" جے شری نے اُسے چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جانے ہماری باری کب آئے گی؟ جانے ہماری باری آنے سے پہلے ہی سب دال بھات ختم ہو جائے گا۔ شاید ہم یہاں کھڑے کھڑے گر پڑیں گے اور ان گنت گدھ ہمیں نوچ نوچ کر کھا جائیں گے..... بھوک کے مارے پیٹ شمشان کی طرح جلتا رہتا ہے۔ ہائے رام۔ ہماری بھوک اب کبھی ختم نہیں ہو سکتی ہم بھوکے ہیں ـــــ اور گدھ بھی تو بھوکے ہیں..... کوئی کہاں تک دھیرج کریگا؟

جانے ابھی اور کتنی دیر ہو گی؟ زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی سہی۔ جلدی نہیں تو بہ دیر ہی سہی۔ بس دال بھات ملے ضرور۔ یہ لنگر والے بھی کتنے دیاوان ہیں۔ وہ ہمیں موت کے مُنہ سے بچانے کے جتن کر رہے ہیں۔

..... جے شری ——— او جے شری ——— گاؤں چھوڑتے ہوئے اُس کے شوہر نے کہا تھا ——— پہلے میری موت ہو گی جے شری۔ جب تک میں زندہ ہوں جم دوت تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتے..... یہ مت کہو پتی دیو، پہلے میں مروں گی، تم بچ جاؤ اور میرا راکھال بچ جائے..... ارے ارے، جے شری تمہیں چنتا کاہے کی۔ راکھال کا بال بھی بیکا نہ ہو گا.....

اُس نے سوچا اس کلجگ میں یہ ایک ست جگی بات ہوئی کہ اس کا شوہر بچن نبھا گیا۔ کنگلے کا جیون کسے پسند ہو گا؟ ارے یہ جیون بھی کوئی جیون ہے؟ یہ تو ایک بوجھ ہے بوجھ، بھاری بھرکم بوجھ، ارے کوئی اسے کب تک ڈھوتا رہے گا۔

..... جے شری ——— او جے شری! کُل کی بیل سدا ہی ہری جے شری ارے ارے تم گربھوتی ہو، جے شری، سات مہینے تو ہو بھی گئے۔ دو مہینے رہتے ہیں۔ بیٹا جنم لے گا تو سب دکھ دلدّر دور ہو جائیں گے اور اگر بیٹی آ گئی؟ اُونھ، بیٹی نہیں چاہیئے، بیٹا چاہیئے بیٹا، بیٹا جو زمین میں ہل چلائے گا۔ بیٹا جو برس کے برس نیا دھان اُگائے گا.....

یہ بھیانک کال اور میں گربھوتی ہوں، جے شری نے جھنجھلا کر راکھال کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جیسے سب غصّہ اُسی پر انڈیل دینا چاہتی ہو لیکن اگلے ہی پل وہ پہلے ہی کی طرح اُس کی گردن تھپتھپانے لگی۔ راکھال ——— چندا بیٹا ——— ہاں ہاں کُل کی بیل سدا ہی ہری۔

سُکھ میں دان دیا جاتا ہے، دُکھ میں دان کا پھل ملتا ہے ——— پیچھے سے ایک بوڑھا کھانستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ہم دان لینے پر مجبور ہیں۔

ایسا کال تو نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا ——— ایک بڑھیا کہہ اٹھی، پہلے تو کال اُسی سمے پڑتا تھا جب برکھا نہ ہوتی اور دھان کی فصل ماری جاتی۔ لیکن اب کے اتنا دھان ہوا ——— اتنا دھان ہوا ——— پھر بھی یہ بھیانک کال ——— ہے بھگوان، یہ کال کب ختم ہوگا؟

ہم پھر اپنے گاؤں کو جائیں گے دادی ——— ایک لڑکی نے شہ دی جن کو مرنا تھا وہ کبھی کے مر گئے۔ اب یہ لنگر والے ہمیں مرنے نہ دیں گے۔

تم جینا چاہو تو شوق سے جیو، بیٹی ——— بڑھیا بولی۔ مجھے تو ایشور اپنے پاس بلا لے تو لاکھ لاکھ دھنیہ باد کروں۔

جے شری بڑے دھیان سے یہ باتیں سنتی رہی۔ دائیں ٹانگ کا بوجھ بائیں ٹانگ پر ڈالتے ہوئے جے شری نے راکھال کا مُنہ چُوم لیا۔ بولی "تیرا باپ تو ہمیں چھوڑ گیا راکھال، اب تو ہی اس کی نشانی ہے۔ راجہ بیٹا، چندا بیٹا۔"

سورگ میں تو کال نہ پڑتا ہوگا ——— بغل سے وہ لڑکی کہہ رہی تھی بھوک کی مہا ماری بھوگتے ہوئے ہمیں کتنا کشٹ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے دیوتا کیا جانیں؟

"شکھیرلا گیا اسے گھر باندھی نوں، انلے پوڑیا گیلو" ——— وہ بڑھیا گنگنا رہی تھی۔ چنڈی داس بابا سچ کہہ گئے ——— سُکھ کے لئے یہ گھر بنایا تھا ہائے یہ آگ میں جل گیا!

اور جے شری کو جھٹ اپنی جھونپڑی کا خیال آیا۔ ابھی تو وہ اسی طرح کھڑی ہوگی۔ اس کے ذہن میں سنکھ کی آواز گونج اٹھی۔ جیسے دیوتاؤں کو جگایا

جارہا ہو۔ دیوتا سورگ میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کی مورتیاں مندروں میں ستھاپت کی گئی ہیں۔ روز رات کو انھیں سُلایا جاتا ہے اور صبح کو جگایا جاتا ہے۔ اشنان کے بعد طرح طرح کے بھوجن ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ زمیندار بابو کے راج محل سے الگ ان کے لئے پکوان پک کر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ زمیندار بابو کو کچھ نہیں کہتے۔ چاہے وہ غریب پر چاپر کتنا ہی اتیاچار کیوں نہ کرتا رہے۔ مہاجن بھی دیوتاؤں کو خوش رکھتا ہے اور ہماری رہی سہی زمینیں ہڑپ کرتے ہوئے زمیندار بنتا چلا جاتا ہے۔ دیوتا چپ ہیں۔ لٹے ہوئے لوگ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں۔ پتھر اور دھات کے دیوتا ان کا نیائے نہیں کر پاتے۔

پیچھے سے دھکے شروع ہو گئے تھے۔ جے شری نے جھٹ راکھال کو سنبھال لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا کٹھن تھا۔ ان لوگوں کو شرم بھی تو نہیں آتی۔ آج انھیں دال بھات نہ دیا جائے تو کل سے یہ آدمیوں کی طرح کھڑے ہوا کریں گے۔ لیکن جھٹ اُس کے دماغ کے دوسرے حصّے سے آواز آئی ——— دال بھات کیوں نہ دیا جائے؟ یہ تو بہت کڑی سزا ہو گی۔ یہ بھی کیا کریں؟ پیچھے سے یہ بھی تو دھکے کھا رہے ہیں.....

کٹھل کے پیڑ نہ ہوتے تو سورج اس کے نیم برہنہ جسم پر سوئیاں چبھوتا چلا جاتا۔ چھاؤں کے باوجود وہ پسینہ پسینہ ہوئی جاتی تھی۔ راکھال نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ گردن گھما کر وہ ماں کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ارے ارے راکھال، تو بھی پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔ میرا راجہ بیٹا ——— چندا بیٹا۔ تجھے بہت بھوک لگی ہو گی۔ ارے آج میں تجھے اپنے حصے میں سے بھی تھوڑا سا دال بھات دیدوں گی ..... پھر ذرا جھک کر اس نے راکھال کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— ہائے یہ تیرے پیٹ کو کیا ہو گیا راکھال؟ ہائے رام یہ کیسی بیماری ہے؟.....

اگلے ہی پل اس نے ہاتھ پھیر کر راکھال کے ماتھے سے پسینے کی بڑی بڑی بوندیں پونچھتے ہوئے اس کا منہ چوم لیا ——— راجہ بٹیا، راجہ بٹیا، ارے ارے آج گرم گرم دال بھات کھائے گا میرا راجہ بٹیا۔

وہ زور زور سے سر کھجا رہی تھی۔ موئی جوئیں۔ لہو پینے والی جوئیں۔ جانے اتنی جوئیں کہاں سے پیدا ہوتی رہتی ہیں؟ جانے یہ جوئیں کبھی مریں گی بھی نہیں ہائے رام۔ یہ جوئیں میرا سب لہو پی جائیں گی۔

جانے اب گاؤں کی کیا دشا ہو گی؟ ——— پیچھے سے وہ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ مجھے گاؤں چھوڑے ڈھائی ماہ ہو گئے۔

اب تو وہاں بھوت بستے ہوں گے بھوت ——— بڑھیا بولی، اب وہاں انسانوں کا کیا کام؟

چاول کا دانہ گاؤں سے نکال کر لے گئے تو گاؤں والے گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ——— وہ لڑکی کہہ اٹھی، اب کوئی اپنے گاؤں کو لوٹ کر نہیں جائے گا

کہاں چلا گیا اتنا چاول؟ ——— جے شری نے جھنجھلا کر کہا، کون لے گیا چاول؟ ہے بھگوان، تجھ سے یہ انیائے کیسا دیکھا گیا؟

قطار آگے کو سرک رہی تھی۔ ابھی لنگر کا دروازہ دور تھا۔ اس طرح تو بہت وقت بیت جائے گا۔ پاؤ گھنٹہ۔ آدھ گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ، جانے کتنے آدھ گھنٹے۔ جے شری کی انگلیاں اس کے بالوں میں دھنس گئیں۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پیچھے سے الجھا الجھا شور سنائی دینے لگا۔ جیسے لوگ لنگر کے دروازے پر دھاوا بولنے کی سازش کر رہے ہوں۔ یہ شور قطار کے اگلے حصے کی طرف سرکنے لگا۔ ہائے دال، ہائے بھات ——— کسی نے نعرہ لگایا اور پھر کل قطار پنکھے کی طرح ڈولتی دکھائی دی

یہ انتظار اسے ایک لمبا، لیے رس خواب معلوم ہوا۔ یہ زندگی تو ایک بوجھ ہے

اسے کب تک اٹھایا جائے؟ اس نے گھوم کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اسی لمحے کے انتظار میں کھڑا تھا کہ یہ ادھیڑ عورت گردن گھما کر اس کی طرف دیکھے۔ وہ جے شری کو گھور رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو، باوری ہم سب مردے ہیں مردے، قبروں سے اٹھ کر ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ چلو پھر سے قبروں میں جا سوئیں باوری!

اُسے سیلاب کا دھیان آیا۔ یہ سیلاب تو ہر سال آتا ہے بھگوان کا سراپ کتنے گاؤں بہہ گئے۔ کتنے مویشی ڈوب گئے، ہائے، ہائے رام۔ آدمی کتنے کشٹ سہتا ہے۔ سیلاب کے بعد زمین میں دراڑیں ہی دراڑیں نظر آئیں۔ تالابوں میں پینے کا پانی گدلا اور کسیلا ہو گیا، ہے بھگوان، یہ سیلاب بند نہیں ہو سکتا! یہ بھوک کا سیلاب۔ ہائے ہم ہی دھان اگائیں اور ہم ہی بھوکے مریں۔ یہ کہاں کا نیائے ہے؟

سر کھجانے کے بجائے اب وہ نتھنوں کے بال اکھاڑ رہی تھی۔ راکھال چاہتا تھا کہ بندر کی طرح زقند لگائے اور ابھی لنگر کے دروازے پر پہنچ جائے اپنے اپنے حصّے کا دال بھات لے کر ہر کوئی پرے ندی کی طرف چلا جاتا ہے وہ بھی اسی طرح کریں گے، اس نے سوچا، وہ ماں کے حصّے میں سے تھوڑا دال بھات ضرور لے لے گا۔ آج اسے کتنی بھوک لگ رہی تھی۔ آج تو وہ اپنے حصے سے ماں کو تھوڑا بھات بھی نہ دے گا۔

پسینے کی بو تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ جے شری کے ذہن میں برابر گاؤں کا خیال چکّر لگاتا رہا۔ اب کسے خبر ہو سکتی ہے کہ وہ لوٹ کر وہاں جائے گی یا نہیں۔ شوہر نہیں تو راکھال تو ہے۔ راکھال محنت کرے گا اور اپنی زمین چھڑا لے گا۔ راستے کے بھکاریوں کی طرح وہ کبھی اپنے بچّے کے ساتھ ماری ماری نہیں پھرے گی۔ وہ ضرور اپنے گاؤں لوٹے گی۔

عمر بھر کا پسینہ جیسے آج ہی ٹپک پڑے گا —— لڑکی کہہ رہی تھی۔

بڑھیا بولی ـــــ کیا دھنواں کیا نردھن پسینہ تو سب کے بدن سے ٹپکتا ہے۔
پیچھے سے بوڑھا کہہ اٹھا ـــــ میں پیاسا ہوں۔ مجھ میں پانی کی بوند بھی نہ ہوگی۔ جانے اتنا پسینہ کہاں سے نکل رہا ہے؟

اور پھر بوڑھے نے جے شری کو ٹھوکا دیا، جیسے پوچھ رہا ہو، باورچی تو کیوں چپ کھڑی ہے۔ لیکن جے شری نے گردن گھما کر بوڑھے کی طرف دیکھنے یا لڑکی سے بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

سامنے سے ایک نوجوان نے گردن گھما کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، ہوں تو میں تیرا کنھیا، رادھے، لیکن میں سچ مچ بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے، رادھے تو بھی بھوکی ہے۔ جے شری نے کنھیا اور رادھا کو دھیان سے دیکھا۔ کبھی وہ بھی تو اپنے کنھیا کی رادھا تھی۔ پھر اسے اپنے شوہر کے آخری دنوں کا دھیان آیا۔ اُسے بھیک مانگنا پسند نہ تھا اور اس نے پران چھوڑ دیئے اُس دن وہ کیسے بلک بلک کر روتی رہی تھی۔ پائل بیچ کر اُس نے واہ سنسکار کے لئے لکڑی خریدی تھی۔ ہائے رام، آج اس چتا کی راکھ ہوا اڑائے لئے پھرتی ہوگی۔ جانے کہاں کہاں؟

اُس کا ذہن پھر گاؤں کی طرف گھوم گیا۔ ابھی کل تک گاؤں میں اس کی عزت بنی ہوئی تھی۔ کہیں نہ کہیں سے جاترا والے آنکلتے۔ کنھیا اور رادھا کا کھیل کھیلا جاتا۔ چنڈی داس کے پد گائے جاتے۔ جیون کو پنکھ لگ جاتے۔ ہر کوئی اڑنے لگتا۔ وہ برس کے برس جاترا والوں کے لئے نیا دھان نکالا کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پیسے لے کر خوش رہتے ہیں۔ وہ مہاجن کی دکان پر چلی جاتی اور سستے داموں دھان بیچ کر نقد پیسے لے آتی۔ رات کو مشعلوں کی روشنی میں جب جاترا والے تھالی میں آرتھی کا چومکھا دیپک رکھ کر اسے ساری سبھا میں گھماتے تو وہ جھٹ اس میں

پیسے ڈال دیتی۔ پچھلی باران کے لئے تین سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ پورے پچاس تو اکیلے زمیندار بابو نے دیئے تھے۔ پورے پچاس۔ اونھ یہ روپے بھی تو ہمارے ہی تھے۔ ارے کام کریں ہم اور موج اڑائے زمیندار بابو۔ دھنیہ ہے تمہارا نیائے ہے بھگوان، دھنیہ ہے تمہاری لیلا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے صرف ایک روپیہ دیا تھا۔ ایک روپیہ۔ کنھیا ناچے، رادھا ناچے، اس کا تو کوئی مول نہیں دیا جا سکتا۔ جاترا والوں کو تو جو کچھ بھی دیا جائے تھوڑا ہے۔ ارے یہی تو ان کی کھیتی ہے مردنگ کہتا ہے۔ کنھیا سانورے اور رادھا گوری۔ رادھا گاتی ہے۔ میں برج کی گوپی مرلی والے کے سنگ راس رچاؤں۔ ارے کہاں برج اور کہاں بنگلہ دیش سارا دیش تو کنھیا سانورے اور رادھا گوری کا ہے۔

یہ بھیانک کال۔ ارے ارے۔ اسے رادھا گوری اور کنھیا سانورے بھی نہ روک سکے، یہ سوچتے ہوئے جے شری نے لنگر کے دروازے کی طرف ایک طویل نگاہ دوڑائی۔ اس نے باہیں پھیلانے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر وہ گاؤں کی یاد میں کھو گئی اسے یاد تھا کہ کیسے چاول مہنگا ہوتا گیا۔ اور کس طرح لوگ اندھے ہو کر چاول بیچتے گئے۔ مہاجن خوش تھے۔ وہ کسانوں کو سمجھا رہے تھے کہ اب مہنگے بھاؤ چاول بیچ ڈالو پھر سستے داموں چاول خرید لینا۔ سمے سمے کا جادو ہے۔ یہ اوسر نت نت تو نہیں آتا اور ہم مورکھوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ دھان فصل تک کھانے کے لائق ہی چاول گھر میں رکھ لیں۔ چاول نکلتا گیا۔ گھر میں کھانے لائق چاول بھی جا رہا تھا۔ آخر وہ بھیانک گھڑی بھی آئی جب مہاجن کہنے لگے کہ چاول کا دانہ سونے کے بھاؤ بکے گا۔ کلجگ میں۔ ارے ارے یہ کیسا کلجگ ہے!

پیچھے سے بوڑھے نے جے شری کو ٹھوکا دیا۔ جے شری مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو، ہاں بابا دنیا مسافر خانہ ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔

اب ہم بھکاری رہیں گے عمر ——— راستے کے بھکاری۔ نت نت تو یہ دال بھات ملنے سے رہا۔ اُسے یاد آیا کہ گاؤں چھوڑنے سے کچھ ہی دن پہلے اُس نے ہاٹ بازار میں ایک بوڑھے رادھا اور کنھیا کی مورتیاں بیچتے دیکھا تھا۔ ارے ارے وہ بوڑھا تو اس بوڑھے سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کتنا مجبور تھا۔ جن مورتیوں کو اُس کے بزرگ پوجتے آئے تھے۔ انھیں وہ بہت سستا بیچ رہا تھا۔ کون جانے یہ وہی بوڑھا ہو اس کے جی میں تو آئی کہ پوچھ لے لیکن وہ چُپ کھڑی رہی۔

پھر اس کے سامنے تارا پر کی شکل گھوم گئی۔ اس نے ان دلالوں کی بُری گت بنائی تھی جو شہر سے عورتوں کی دلّالی کرنے آئے تھے۔ حرامی سُور، راکشش، چلے آئے گاؤں میں۔ ارے گاؤں کی کنیائیں بھی کس کی بیٹیاں ہیں، کسی کی بہنیں، حرامی، سور، راکشش، یہ گالیاں اس کے ذہن میں گونج اٹھیں..... ہائے ری دُنیا۔ اُسی تارا پر نے گاؤں کی سب سے سندر لڑکی کو پکڑ کر بیچ ڈالا۔ جانے وہ کدھر نکل گیا۔ حرامی، سور، راکشش۔ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ ایک نہ دو نہ تین پوری سات لڑکیوں کو بیچ چکا تھا۔ اسے تو خوب بھات ملتا ہوگا۔ رس گلّے، سندیش اور جانے کیا کیا مٹھائی۔ اسے ہماری طرح لنگر کے سامنے گھنٹوں انتظار نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ اب تو وہ بڑا دلّال بن چکا ہوگا۔ سب سے بڑا دلال۔

اب لنگر کا دروازہ نزدیک تھا۔ راکھال خوش نظر آتا تھا۔ اب ماں کا ہاتھ کھینچ کر لنگر کے دروازے تک دوڑ لگانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ گرم گرم دال، گرم گرم بھات وہ خود کھائے گا۔ ساں لاکھ کہے کہ مجھے تھوڑا سا دے دو، راکھال، بھگوان نے میرے بڑا پیٹ لگایا ہے۔ اور مجھے تم سے زیادہ بھوک لگی ہے۔ وہ ایک نہیں سنے گا۔

..... جے شری ——— اوجے شری، ارے مہاجن کے پاس سب زمین

بندھک رکھ دی اور ایک بوری چاول ملا۔ ایک بوری چاول۔ ارے جانتی ہے آجکل ایک بوری چاول کا کیا مول ہے؟ سوا دو سو بلکہ ڈھائی سو، ارے اب تو کوئی تین سو بھی مانگ لے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ..... پتی دیو، سات دن سے ہم گھوئیاں کے پتے کھا رہے ہیں اور گھوئیاں کے پتے بھی کب تک ملیں گے؟..... ارے سن تو جے شری، آدھ بوری چاول کے لئے ایک بیگھہ زمین بیچ کر آ رہا ہوں، پاپ، مہا پاپ، پتی دیو، یہ تو تم نے راکھال کا بھاگیہ بیچ ڈالا۔ ہائے رام۔ اب راکھال یہ زمین کبھی نہ چھڑا سکے گا..... ارے میں کیا کرتا، جے شری؟ مہاجن تو ساری زمین کی رجسٹری کرا لینے کے بدلے دو بوری چاول دینے کو تیار تھا۔ میں نے سوچا راکھال کا سارا بھاگیہ کیوں بیچ ڈالوں..... ارے ہماری زندگی میں تو یہ کلجگ ختم ہونے سے رہا۔ پتی دیو، یہ کال ہمیں کھا جائے گا۔ پھر سست جگ آئے نہ آئے پتی دیو..... چلو اس گاؤں سے نکل چلیں۔ اب ہم دھان کی فصل کے لئے بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے.....

اسے یاد تھا کہ انھوں نے رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گاؤں چھوڑا تھا۔ اس رات مہاجن کی بیل گاڑیاں بھی کسی چور بازار کی لمبی پراسرار یاترا پر چل پڑی تھیں۔ چاول ہی چاول۔ اتنا چاول کہاں جا رہا تھا۔

اب وہ لنگر کے دروازے کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اسے اُسی وقت پتہ چلا جب راکھال نے اپنے حصّے کا دال بھات لے لیا۔ اس نے بھی اپنے حصّے کا دال بھات سنبھال لیا۔

ان داتا سدا ہی سُکھی ——— وہ بولی، ان داتا کی سدا ہی جے۔

ماں، ٹھنڈی دال اور ٹھنڈا بھات ——— راکھال نے للچائی نگاہوں سے ماں کا دال بھات لیتے ہوئے کہا، یہ تو بہت تھوڑا سا ہے ماں۔

تھوڑا بھی بہت ہے بیٹا ـــــ جے شری نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ارے بیٹا، یہ بھی نہ ملتا تو ہم کیا کر لیتے؟

وہ ندی کی طرف چلے جا رہے تھے، پیچھے سے وہ لڑکی جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ آ ملی۔

ذرا رک کیوں نہیں جاتی، دیدی ـــــ لڑکی بولی، میری ماں کو بھی آ لینے دو ہم ایک ہی گاؤں کی نہیں تو نہ سہی، بھگوان نے ہمارا ملاپ کرا دیا۔

ہاں بہن ہم دُکھ کے ساجھی ہیں ـــــ جے شری نے اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے کہا۔ اُس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت لہرا گئی، جیسے وہ کہہ رہی ہو ارے ارے، میرا تو خیال تھا تم اس نوجوان کے ساتھ بیٹھ کر دال بھات کھاؤ گی۔

پیچھے سے لڑکی کی ماں بھی آ گئی۔ آتے ہی اس نے راکھال کی ٹھوڑی اٹھا کر اُسے پیار سے چُوم لیا۔ ارے چندا بیٹا، تھوڑا دال بھات تو تجھے میں بھی دے سکتی ہوں اپنے حصے میں سے۔

لڑکی گھبرا گئی۔ بولی۔ ارے سبھی تو جیوت رہنا ہے ماں، اپنے حصّے کا دال بھات ہر ایک کو خود کھانا چاہیئے۔

ندی کنارے پہنچ کر انھوں نے اپنا اپنا دال بھات کھا لیا۔ راکھال کے پھولے ہوئے پیٹ پر نگاہیں جماتے ہوئے ماں کہہ رہی تھی ـــ ارے بیٹا، تیرا پیٹ تو ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی زمیندار کے بیٹے ہو۔

یہ تو کم بھوجن کے کارن ہے ماں ـــــ جے شری بولی اب کون وید راکھال کو اوشدھی دے گا؟

جے شری کی راتوں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا تھا۔ اس کے کولھے بھی بُری طرح دکھ رہے تھے۔ وہ زمین پر لیٹ گئی۔

راکھال بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا، جیسے دیا بجھ رہا ہو، جیسے چاند ڈوب رہا ہو۔

جے شری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی اور ماں بھی گھبرا گئیں۔ انھوں نے راکھال کو آرام سے لٹا دیا۔ ماں آہستہ آہستہ اس کا پیٹ سہلانے لگی۔ اور وہیں لیٹے لیٹے راکھال کی آنکھ لگ گئی۔

جے شری برابر گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بولی ——— "کچھ تمہیں بھی معلوم ہے بہن کہ یہ کلجگ کب ختم ہوگا؟"

"یہ تو بہت کٹھن پرشن ہے دیدی۔ اس کا جواب تو لال جھنڈے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ جو ہمیں روز سمجھاتے ہیں کہ نیا زمانہ آنے والا ہے۔"

لیٹے لیٹے راکھال نے کروٹ لی۔ اُسے نہایت پتلی اجابت ہوئی۔ جے شری نے راکھال کو پونچھ کر دوسری طرف لٹا دیا۔ اور مٹی ڈال کر غلاظت کو ڈھک دیا اُس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس بار پھر ماں راکھال کا پیٹ سہلاتی رہی۔

"ست جُگ، نیا زمانہ، یہ کب آئے گا، بہن؟" جے شری نے مائل پرواز پرندے کی طرح باہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی، دیدی۔ سُنتی ہوں! نئے زمانے میں زمیندار نہ ہوں گے جو ہل چلائے گا، وہی زمین کا مالک ہوگا؟"

"پر یہ زمانہ کب آئے گا ——— ست جگ؟"

"لال جھنڈے والے کہتے ہیں، دیدی کہ یہ دال بھات ہمیں دان میں نہیں دیا جا رہا۔ اس پر ادھکار ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ سب لوگ پھر اپنے اپنے گاؤں کو لوٹیں گے پھر نیا دھان ہوگا۔ ہم اتنا کھائیں گے کہ خوب موٹے ہو جائیں گے۔" اس نے اپنی

بانہوں کو پھیلاتے ہوئے کہا۔

جے شری نے بہت سے قلعے تعمیر کر لئے۔ کلجگ ختم ہوا۔ ست جگ شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ ست جگ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کا ذہن بیدار ہو گیا۔ کنھیا کی بانسری گونج اٹھی ایک نیا نغمہ، جاتترا والے سبھا میں چومکھا دیا گھما رہے تھے۔ لوگ بڑھ بڑھ کر تھال تلیے ڈال رہے تھے کنھیا کہہ رہے تھے ——— اب اس دیش میں کال نہیں پڑے گا۔ رادھے!.... اور رادھا کہہ رہی تھی ——— دیکھو، کنھیا، اب کبھی زمیندار کسانوں پر حکم نہ چلائیں چور بازار بھی سب ختم ہو جائیں..... اور کنھیا کہہ رہے تھے ——— جو ہل چلائے وہی زمین کا مالک، زمیندار وہی جو ہل چلائے.....

راکھال کی حالت خراب ہوتی گئی۔ جے شری گھبرا گئی۔ اُس نے راکھال کا سر اپنی رانوں پہ رکھ لیا تو کیا یہ دیا بجھ جائے گا۔ جیسے وہ اسے اپنے آنچل میں چھپا کر ہوا کے حملے سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ارے ارے یہاں تو دیئے کا تیل ہی ختم ہو رہا ہے۔ ہائے رام میں لٹ جاؤں گی۔

لڑکی بولی "گھبراؤ مت دیدی، راکھال اچھا ہو جائے گا۔

جے شری ہونی سے بے خبر نہ تھی۔ وہ موت کو دیکھ سکتی تھی۔ راکھال کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ جیسے وہ کسی چھپی ہوئی طاقت سے دعا، مانگ رہی ہو۔ اُس نے راکھال کی نبض پہ ہاتھ رکھا اور چیخ ماری۔

راکھال کی نبض ڈوب رہی تھی۔

اُس کا خون سب پانی بن چکا تھا۔ اور اب تو یہ پانی بھی خشک ہو رہا تھا۔ سب کے دیکھتے دیکھتے اس نے پران چھوڑ دیئے۔

لڑکی لال جھنڈے والوں کو بلا لائی۔ وہ تین آدمی تھے۔ ایک نے اپنے ہاتھ میں جھنڈا تھام رکھا تھا۔ جھنڈے پہ ہنسیا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ تو وہی ہمارا

ہنسیا ہے۔ ہمارا دھان کاٹنے کا ہنسیا۔ اُس نے اپنی کلائیوں میں چاندی کے کنگن دکھائے لیکن انھوں نے اُنھیں قبول نہ کیا۔

وہ دوڑ کر لکڑی لیتے آئے۔ ذرا ہٹ کر چتا بنائی گئی۔ جے شری نے اپنی چیتھڑا چیتھڑا چادر میں راکھال کو کفنا دیا۔ جھنڈے والوں نے اسے اٹھا کر چتا پر رکھا۔ جے شری نے اپنے ہاتھ سے چتا کو آگ دکھائی۔

لال لال شعلوں کے پس منظر میں رات کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے۔ جے شری بولی۔ "ابھی کلجگ کا انت ہونے میں دیر ہے۔ ابھی ست جگ شروع نہیں ہو سکتا۔

جھنڈے والے جا چکے تھے۔ جے شری چتا کے قریب لیٹ گئی۔ لڑکی اور ماں اسے تسلّی دیتی رہیں ..... جے شری، او جے شری، جیسے اس کا شوہر اُس سے کہہ رہا ہو۔ ارے میری نشانی تو تیرے پاس رہے گی، ارے تو گربھوتی ہے جے شری ..... اور پھر جیسے اسے ذہنی دھچکا سا لگا ہو۔ یہ بھوک ـــــ بھیانک بھوک اور میں گربھوتی ہوں۔ میری بھوک کوئی آج کی بھوک تو نہیں۔ یہ تو جگ جگ کی بھوک ہے ـــــ اور پھر اسے خیال آیا کہ یہ بھوک کا کلجگ کبھی ختم نہیں ہوگا ـــــ ہائے رام ست جگ کیسے شروع ہو سکتا ہے۔

وہ رات رتجگے ہی میں کٹ گئی۔ سُورج کی پہلی کرنوں کی روشنی میں جے شری نے چتا سے راکھ کی چٹکی اٹھا کر ماتھے پر لگائی۔

اُس کے ذہن میں پھر ان گنت گِدھ منڈلانے لگے۔ یہ گدھ بہت بھوکے تھے اب یہ گدھ زندہ انسانوں پر جھپٹنا چاہتے تھے .....

ایک دن، دو دن، تین دن ـــــ

جے شری وہیں پڑی رہی۔ لڑکی اور ماں کے لاکھ اصرار کرنے پر بھی وہ لنگر کی طرف

جانے کے لئے رضامند نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح مرجانا چاہتی تھی۔

"تم تو گربھ وتی ہو دیدی، اور گربھ وتی کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے" لڑکی نے جے شری کے سینے پر اپنا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جے شری نے ناک سکوڑتے ہوئے لڑکی کو پرے ہٹا دیا۔ اسے شاید لفظ "گربھ وتی" سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔

ماں بولی۔ "تیرے تو بیٹا جنمے گا، بیٹی جے شری۔"

جے شری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا اس کا بیٹا ست جگ میں جنمے گا۔ وہ اپنا بھاگیہ اپنے ساتھ لائے گا۔ وہ ست جگ میں پلے گا۔

لڑکی بولی "لال جھنڈے والے کہتے ہیں، دیدی کہ زمین نئی کروٹ لے رہی ہے، اب نیا زمانہ شروع ہوگا۔"

"نیا زمانہ ـــــ ست جگ؟"

"ہاں دیدی، وہ کہتے ہیں۔ انھوں نے سمے کے مڑتے دھارے کو دیکھ لیا ہے۔"

"وہ سچ کہتے ہوں گے؟"

"وہ کہتے ہیں! اب نئی پربھات گی۔ دھرتی کی کایا پلٹ جائے گی۔"

"سچ؟"

"وہ کہتے ہیں، اب نیا دھان اُگے گا۔ جنتا کے لئے دھان۔ سب کے لئے دھان۔"

جب تو ست جگ آرہا ہے۔ ست جگ۔"

پاس سے ماں نے چڑ کر کہا۔ "ابھی ست جگ کہاں؟ ابھی کالجگ ہے ـــ مجھ سے پوچھو تو یہ کلجگ کبھی ختم نہ ہوگا۔"

ماں نے ایک دلّال کی بات چھیڑ دی۔ جے شری کی آنکھوں میں تاراپد کا روپ گھوم گیا۔ ماں کہہ رہی تھی "وہ مجھ سے میری بیٹی مانگتا تھا، کہتا تھا، تیری بیٹی تو راج کنیا ہے۔ اس کے بھاگیہ میں تو رانی ہونا لکھا ہے۔ بول اس کا کیا لے گی۔ نگوڑے نے رتّی بھر شرم نہ کی۔"

"تم نے کیا جواب دیا ماں؟" جے شری نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے سو کی ایک ہی بات کہہ دی کہ نہ بابا۔ میری لڑکی تو بھاگیہ وتی ہے وہ اپنا بھاگیہ خود چنے گی۔"

جے شری نے سوچا شاید تاراپد ادھر آنکلا ہو۔ شاید یہ تاراپد ہی ہو۔ لڑکی سر جھکائے بیٹھی رہی اور انگلی سے دھول پر گول گول گھیرے بناتی رہی۔

حرامی، سور، ہارکشس ——— جے شری نے تاراپد کو من ہی من میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "پاپیوں کی نیّا بھر کر ڈوبتی ہے۔"

"ہاں، بیٹی، پاپیوں کی نیّا بھر کر ڈوبتی ہے۔"

"اُس دلّال نے اپنا نام کیا بتایا تھا، ماں؟ تاراپد تو نہیں تھا اُس کا نام؟"

"میں نے پوچھا نہیں بیٹی اور اُس نے بتایا نہیں اپنا نام۔"

"دیکھنے میں کیسا تھا وہ! ——— بہت موٹا تازہ گھنگھریالے بال بڑی بڑی آنکھیں ——— اور آواز ایسی جیسے جھانجھ بجتی ہے ——— کہو نا ماں؟"

"تم نے کیسے جان لیا بیٹی؟ وہ ٹھیک ایسا ہی تھا؟"

"وہ وہی تاراپد ہوگا۔ وہ ہمارے گاؤں گا تاراپد۔"

"تمہارے گاؤں کا تاراپد۔"

"ہاں، ماں، پہلے تاراپد نیک آدمی تھا۔ اُس نے پہلی بار گاؤں میں آنے والے دلالوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ پھر خود دلّال بن گیا۔ یہ کیسا کلجگ ہے!

دیوتا بھی راکشس بننے لگے۔"

"پہلے دستر اُجلا ہوتا ہے بیٹی، میلا ہونے پر اسے دھویا بھی جا سکتا ہے۔"

اُدھر لڑکی دھول پر بہت بڑا چکر بنا چکی تھی۔ جے شری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہی کہنا چاہتی ہو نا بہن کہ سماں بھی ایک چکّر ہے۔"

"ہاں، دیدی، نہ اس کا آدی ہے نہ انت۔"

"ست جگ، ترتیا، دواپر، کلجگ اور کلجگ کے بعد پھر ست جگ آتا ہے ——— پہلے دستر اُجلا ہوتا ہے۔ پھر جب یہ دُھل جاتا ہے تو سمجھو ست جگ آگیا۔"

"ست جگ ضرور آئے گا دیدی، اپنی زمین ہو گی، اپنے ہل، اپنے ہنسیے اور دھان اگانے والے کسان کنگلوں کی طرح لنگڑوں کے سامنے کھڑے نہیں رہا کریں گے۔"

جے شری زمین پر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا وہ گربھوتی تھی کیسی کیسی ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔ ابھی تو دو مہینے باقی ہیں، اُس نے سوچا لیکن پچھلے تین دن سے پیٹ میں بچّے کی حرکت بند ہو چکی ہے۔

ماں بولی۔ "چند ابٹیا تو سمے پر جنمے گا۔ ہم تو تیرے پاس ہیں تجھے فکر کاہے کی؟"

..... جے شری ——— او جے شری۔ ہم تو سو سو پیڑھیوں سے کسان ہیں ..... ہاں پتی دیو، ہمارا زمیندار ہمیشہ ہم پر اتیاچار کرتا آیا ہے ..... جے شری ——— او جے شری، ہماری حالت کبھی نہیں بدلی ..... ہاں پتی دیو، ہمارے گاؤں میں سدا کال پڑا رہا ہے ..... جے شری ——— او جے شری، یہ کال پہلے سب کالوں کی چرم سیما ہے ——— آخری حد ..... ہم پتی دیو، اب تو جگ پلٹ رہا ہے۔ کلجگ کے گربھ سے ست جگ جنم لے رہا ہے اور ان ٹیسوں کا اٹھنا تو ضروری ہے .....

"ہائے میں مر گئی، میری میّا" ——— جے شری بار بار چلّا اٹھتی تھی! اس کا کشٹ

کوئی معمولی کشٹ نہ تھا۔ لڑکی کہیں سے تھوڑا تیل مانگ لائی تھی، ماں برابر ایک دائی کی طرح جے شری کے پیٹ پر مالش کرتی رہی۔

سمے سے پہلے ہی بچّے نے جنم لے لیا۔ تھا تو بیٹا۔ لیکن مُردہ۔ ماں نے جے شری کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بچّے کو ڈھک لے بیٹی، ہائے رام ـــــ بھاگیہ کو کون بدل سکتا ہے۔"

جے شری بے ہوش پڑی تھی۔

ذرا ہوش آنے پر وہ ہلی۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ جیسے وہ بچے کا مُنہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہو۔ لیکن ایک دھچکے کے ساتھ وہ گر پڑی۔ اس کا کشٹ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ نیا دھان اُگے نہ اُگے، اب اُسے کیا؟

لڑکی نے مستقبل قریب کی طرف طویل نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا "جے شری نے کہا تھا نا، ماں، کہ کلجگ ختم ہونے والا ہے اور پاپوں کی نیّا ڈوبنے والی ہے۔ کیا اپنے دھچکے سے جے شری نے پاپوں کی نیّا کو ڈبونے کے لئے آخری زور تو نہیں لگا دیا؟"

بنگال

نغمۂ غم کے لئے ساز کہاں سے لاؤں ؟
آہ و فریاد کی آواز کہاں سے لاؤں ؟
حشر دکھلانے کے انداز کہاں سے لاؤں ؟
ملک الموت کا اعجاز کہاں سے لاؤں ؟

اے فلک اپنی مجھے روحِ شمگر دیدے
دلِ مجروح کے بدلے کوئی پتھر دیدے

لاکھوں انسانوں کا وہ راہ پہ مرجانا ہائے
چار لقموں کے لئے جاں سے گزر جانا ہائے
ہائے معصوم سے چہروں کا اتر جانا ہائے
پوچھنا راہ روِ غم سے "کدھر جانا ہائے"

کیسے دیکھا گیا اے عالمِ فانی تجھ سے
کیسے لوٹی گئی دُنیا کی جوانی تجھ سے!

بھوک افلاس و مصیبت کی فراوانی تھی
ہر طرف درد کی اور موت کی ارزانی تھی
بھوکے انسانوں کی اک سمت گراں جانی تھی

اک طرف حاکم وزردار کی انجانی تھی
کُون سے جُرم کی پاداش تھی معلوم نہیں
روح کیوں موت کی بشاش تھی معلوم نہیں!
کیا مصیبت تھی کہ دوشیزہ نے عصمت دیدی؟
کیا قیامت تھی کہ ماؤں نے محبّت دیدی؟
کیا تقاضا تھا کہ بہنوں نے اخوّت دیدی؟
کیا تماشا تھا میاں بیوی نے عزّت دیدی؟
کیا ضرورت تھی کہ ماں باپ نے بچّے بیچے؟
اور اغیار نے دوشیزہ کے آنچل کھینچے!
چیتھڑے پہنے ہوئے کتنے ستارے نکلے؟
منہ چھپائے ہوئے کیا راج دلارے نکلے!
لڑکھڑاتے ہوئے جینے کے سہارے نکلے!
اس طرح چھوڑ کے گھر بھوک کے مارے نکلے!
لاکھوں بیمار رہوئے، روندے گئے، خوار ہوئے
اور اک دانۂ گندم کے طلب گار ہوئے!
عبرت اے دہر کہ تہذیب کی دُنیا ہے یہی
ہر نفس کشمکشِ اہلِ تمنّا ہے یہی
رات دن عالمِ فانی کا تماشا ہے یہی
قسمتِ دوش یہی، قسمتِ فردا ہے یہی
ہم غلاموں کی یہی ذلّت وخواری ہوگی!
آج بنگال ہے، کل اور کی باری ہوگی!

پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی (جامعہ عثمانیہ)

بنگال کا خونیں جغرافیہ

مجھے وہ دن اب تک یاد ہیں جب جغرافیہ کا سبق پڑھتے ہوئے مجھے سمتیں یاد رکھنی پڑتی تھیں۔ سامنے ہندوستان کا نقشہ ہوتا۔ خط کا بنایا ہوا براعظم کاغذ کے ایک ورق پر سمٹ آتا۔ اور ہم میں استاد کی لمبی ہر بید کے اشارے سے جو صفحۂ ارض پر اس طرح کھیلتی جس طرح ریڈیو کی لہریں فضائے آسمانی پر کھیلتی ہیں۔ یہ معلوم کرتا کہ ہندوستان کا شمال کوہِ ہمالہ کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کے صوبوں میں بنگال وہ صوبہ ہے جس میں برہم پتر اور گنگا کے دہانے مل جاتے ہیں۔ آج بنگال کی حالت دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جغرافیہ اور ہے جو غریبوں کے خون، ماؤں کی فریاد، بچّوں کی چیخوں اور بڈھوں کی آخری ٹھوکروں سے پہچانا جاتا ہے۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے۔ جب ایک ظالم استاد نے مجھ جیسے گھبرائے ہوئے طالبِ علم سے یہ پوچھا تھا۔ بتاؤ شمال کس طرف ہے۔ مجھے اس وقت شمال اور جنوب کا صحیح فرق اور محلِ وقوع معلوم نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ہندوستان کا نقشہ سامنے آویزاں ہے۔ اور شمال اس نقشے کے اوپر کی جانب ہے۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ شمال یہ ہے! آج ہندوستان کا شمال اور بنگال کے شمال مشرق کو دیکھ کر بے اختیار اور سچ مچ آسمان ہی کی طرف سر اٹھانے کو جی

چاہتا ہے۔ جب میں بنگال میں دو دریاؤں کے ملنے اور دریائے ہُگلی کے بندرگاہ کا خیال کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج دو دریا تو کیا۔ خون کے سینکڑوں دریا یہاں بہتے ہیں۔ اور قدم قدم پر اُن کے خونیں دھارے ایک جا سمٹ آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بنگال کے شمال میں جغرافیائی ہمالہ شاید نہیں رہا۔ اس کے چاروں طرف اب بیکسی کے ایسے پہاڑ نظر آتے ہیں جنکی چوٹیاں ننگے سر ظالم آسمان سے رحم و کرم کے لئے فریاد کرتی ہیں۔ افسانوں میں بنگالے کا جادو اور شاعری میں صبح بنارس کا ذکر سنتے آئے ہیں۔ آج حقیقت کی آغوش میں جادو سر کے بل گر چکا ہے۔ اور صُبح، خونیں شام سے بدل چکی ہے۔ یہ نیا جغرافیہ اور یہ نئی تاریخ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں جیتا جاگتا درس عبرت ہے۔ پہلے ہندوستان میں انقلاب شمال مغربی پہاڑوں سے آیا کرتا تھا۔ آریین قوم، تاتار، ہُن، مغل۔ سب اسی سمت سے ہندوستان میں آئے۔ اور انھوں نے اس برّاعظم کی تقدیر بدل دی۔ کیا عجب ہے کہ اب انقلاب بنگال کی سرزمین سے اٹھے۔ اس سرزمین کے انقلابی لشکر کے ہاتھوں میں تیغ و تفنگ نہیں، بلکہ انسانوں کے ڈھانچے، عورتوں کے سر، بچّوں کے سوکھے ہوئے لب اور بڈھوں کے گھگھیائے ہوئے جبڑے رہیں گے۔ جن کے اندر سے موت کے راگ سُنائی دیں گے۔ آہ ان غریبوں کی پرچھائیاں موت کے بعد بھی شاید ایک ایک دانۂ گندم کو ڈھونڈتی پھریں گی! اے سر جگدیش چندر بوس کی سرزمین تیرے سپوت نے یہ بات دریافت کی تھی کہ شجر اور حجر میں بھی زندگی ہے لیکن اسے کیا خبر تھی کہ ۱۵ سال بعد ہی وہاں کے چلتے پھرتے انسانوں اور لاکھوں انسانوں سے زندگی چھین لی جائے گی۔ آہ وہ بنگال، جہاں ٹیگور کے مقدس لہو نے ذرّے ذرّے کو گرمایا تھا۔ آج خون کے ایک قطرے سے عاری ہے۔

اے نذرالاسلام، کیا تو نے اسی دن کے لئے اپنے جنگجو گیت گائے تھے کہ قدرت تجھ سے یہ انتقام لے! اور تیرے ہم وطنوں کو ایک مٹھی بھر اناج کے لئے جان دینی پڑ جائے۔ آج اس قیامت کو دیکھ کر تیرے آگ اگلنے والے گیت بھی سرد معلوم ہوتے ہیں۔ جی میں آتا ہے ہمالیہ کی چوٹی پر جا کر بیٹھ جاؤں، اور وہاں کی سرد ہواؤں سے پوچھوں کہ ان کی سردیاں کیا ہوئیں۔ بنگال میں موت کی سردیوں نے دل کو اتنا سرد بنا دیا ہے کہ اب ہمالیہ کی چوٹی پر بھی سردی محسوس نہیں ہوتی!

آہ، مدتوں سے ایک خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک شاعر کے اس مندر کی سیر کروں، جسے دنیا "شانتی نکیتن" کہتی ہے۔ سنا تھا کہ وہاں مراقبے ہوتے ہیں۔ دل کو خدا کی یاد سے سکون پہنچایا جاتا ہے۔ شاعری، موسیقی اور حضوری کی روح پرور فضاؤں میں روحِ انسانی جھولا جھولتی ہے۔ وہاں امن اور شانتی کے پیغام سنائے جاتے ہیں۔ ٹیگور کے بعد لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ شاید "شانتی نکیتن" اس روحِ عظیم کے چلے جانے سے "شانتی نکیتن" نہ رہیگا میں نے ان کو جواب دیا تھا کہ حقیقی شاعر روحانی ہوتا ہے اور جب اس کا جسم دنیا کی نظروں سے چھپ جاتا ہے تو اس کی روح کی آواز اور زیادہ صاف سُنائی دیتی ہے۔ میں جب "شانتی نکیتن" جاؤں گا۔ تو اس شاعرِ اعظم کی آواز کو عالمِ بالا کی پُرسکون فضاؤں سے زیادہ کیف آور انداز میں سنوں گا۔ لیکن آہ یہ خواب اب شرمندۂ تعبیر ہو بھی جائے تو میرے کام کا نہیں۔ اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ لاکھوں مظلوموں کی روحیں فریاد کرتی ہوئی شاعرِ اعظم کے سامنے کھڑی ہوئی ہیں۔ مردوں کا ایک قافلہ ہے جو کراہتا ہوا فضائے عالم سے گزر رہا ہے۔ وہ شاعرِ اعظم سے پوچھ رہا ہے کہ اے علم کے دیوتا، بتا،

کیا تو نے اپنی شاعری میں جو امن کا پیام دیا تھا، جو محبت اور پوجا کے راگ گائے تھے۔ ان کا صلہ یہی ہے؟ کیا تو نے ہمیں زندگی کے اسی انجام کی خبر دی تھی! آہ اب عالمِ بالا سے امن اور چین کے نغمے سنائی نہ دیں گے! ٹیگور کی روح مدتوں اس کے وطن کی بے بسی پر خون کے آنسو بہائے گی۔ جب تک انسانوں کے سینوں میں دل دھڑکتے رہیں گے، اس وقت تک ان کے دلوں کی یہ دھڑکن کسی بھوکے انسان کی آخری ہچکی کی یاد دلائے گی۔ اب بنگال کو شانتی نکیتن کی ضرورت نہیں ——— آگ بھون کی ضرورت ہے۔ تاکہ ظالم انسانوں کو ان کے ظلم کا مزہ چکھایا جائے، اور بے رحم اس میں جل کر بھسم ہو جائیں۔

غالب نے سچ کہا تھا ——— درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ——— اب میری نظروں میں بنگال کا ایک نیا جغرافیہ اور نئی تاریخ لکھی جائیگی جغرافیائی حدود انسانوں کے سروں سے متعین کی جائے گی۔ اور تاریخ کے خون رلانے والے واقعات خون کی روشنائی سے درج ہوں گے۔ کیونکہ ظلم اور بیکسی کی انتہا کا یہی انجام ہے۔ ہندوستان میں اب اس کے سُننے کے لئے نہیں بننے کے لئے بنگال کا حشر برپا ہوا ہے۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ یہ کس طرح بنے گا۔ کیا انسان کا دل واقعی اتنا سخت ہو گیا ہے کہ اس کے پگھلنے کے لئے قدرت کو اتنا بڑا حشر برپا کرنا پڑا۔ اور کیا اس کے بعد بھی انسان کا دل پگھل رہا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ اس کا جواب تو اس وقت ملے گا جب ہم پہلے بنگال کی تباہی کی داستان سنیں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ اس کا مداوا کس طرح کیا گیا

دیکھئے، بنگال کی سرزمین، جو ایک قدیم تہذیب اور تمدن کی حامل ہے پہلے پہل ۱۹۴۳ء میں قحط سے دوچار ہوئی۔ اس بدقسمت ملک کی وسعت بیاسی ہزار

نو سو پچپن مربع میل ہے۔ اور آپ کا دل یہ سن کر کیا کہے گا جب آپ معلوم کریں گے کہ اس میں تقریباً اکیس ہزار چھ سو پینتیس مربع میل پر بسنے والے انسان موت کا شکار ہو گئے۔ زراعت، صنعت، حرفت اور تجارت پر ہر ملک کی خوشحالی کا دارومدار پڑتا ہے۔ زراعت کا حال سنیئے، بنگال کی آبادی چھ کروڑ ہے۔ جس میں سے ۴۲ لاکھ کروڑ کسان ہیں۔ اور بنگال میں ۹۰ فی صد چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بنگال میں قحط آیا۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ اس کا جواب رپورٹیں اور یادداشتیں دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بنگال بھوکا مرا۔ بڑا سبب یہ ہے کہ کسان زمیندار کے ہاتھوں بک چکا ہے۔ بہت ساری زمین ابھی بغیر کاشت کے پڑی ہوئی ہے۔ ہر سال سات کروڑ من چاول کی کمی پڑتی تھی۔ جس کو مدتوں سے بنگال برداشت کرتا تھا۔ جب یہ کمی پوری نہ ہوئی اور جنگ اور بیماری کی وجہ سے انتظام نقل و حمل مشکل ہوا، زمیندار ظالم اور حریص بن گئے۔ چاول کا ایک ایک دانہ سونا سمجھ کر چھپایا جانے لگا جاپان کی بمباری ہوئی، اور شیرازۂ حیات منتشر ہوا تو چاول بلاک مارکٹ میں چلا گیا۔ اسی طرح نمک تیل وغیرہ کی قیمتیں بھی حد سے زیادہ بڑھ گئیں کسانوں نے بیلوں کی جوڑیاں بیچ دیں۔ زمین فروخت کر دی، اور خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ اب نہ کاشتکار رہے اور نہ اناج!

صنعت و حرفت کا حال یہ ہوا کہ لوہار، کمہار، جولاہے، موچی، بڑھائی، دھوبی سب کے سب بیکار ہو گئے۔ سوت، لوہا، چمڑہ، اشیائے خام حتیٰ کہ مٹی بھی بلاک مارکٹ میں چلی گئی۔ اور سونے کے مول فروخت ہونے لگی بنگال میں ۲۲ لاکھ جولاہے آباد ہیں۔ جب سوت نہ ملا تو یہ سب کے سب بیکار ہو کر بھیک مانگنے لگے۔ آہ وہ کیا منظر ہو گا کہ ۲۲ لاکھ کاریگر ایک ایک دھاگے کو

ترس رہے ہوں گے۔ چٹگانگ کا حال سنیئے۔ جہاں کی آبادی ۹۲ ہزار ہے اور ان میں سے اکثر مچھلیا رے ہیں۔ ان کے مختلف خاندان اپنی کمائی سے دس اور خاندانوں کو پرورش کرتے تھے۔ قحط اور جنگ، بلاک مارکٹ ہونے اور امداد نہ ملنے سے ان کے جال، کشتیاں، گھر کا اثاثہ، جھونپڑیاں سب بک گئیں تقریباً آٹھ ہزار مر گئے اور اس سے بھی زیادہ بھیک مانگنے نکلے اور وجہ معاش سے محروم ہو کر مرنے لگے۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی ملک پہلے سے خود مکتفی ہو، اور وہاں کے قوانین حیات، حکومت اور رعایا کے رابطے کے ساتھ چلتے ہوں تو وہ ملک جنگ اور قحط کی غیر معمولی سختیاں برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں پہلے سے زندگی مشکل سے کٹتی ہو۔ وہاں ایک مصیبت کے ٹوٹتے ہی سیکڑوں مصیبتیں اور سر پہ سوار ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں قحط شروع ہوا۔ یہ مصیبت صرف غلے پر نہیں آئی۔ بلکہ اس کے اثر سے زندگی کی ہر چیز تباہ ہونے لگی۔

تجارت کا مختصر حال یہ ہے کہ گاؤں اور شہر میں جب رابطہ قائم رہتا ہے اور لین دین کے اصول دیانت داری پر مبنی ہوتے ہیں۔ تو دونوں مقامات کے رہنے والوں کو آسانی سے ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ لیکن جب انتظام نقل و حمل باقی نہیں رہتا، زمیندار، سرمایہ دار روپے کی مدد سے اور رشوت دے کر چیزیں خریدتے اور جمع کر کے رکھتے ہیں۔ ہر چیز بلاک مارکٹ میں چھپ جاتی ہے۔ تو پھر گاؤں اور شہر دونوں کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔ بنگال میں یہی قیامت آئی۔ مختصر خاکہ یہ ہے کہ چھ کروڑ میں سے دو کروڑ تباہ ہیں (۹۰) مقامات میں سے (۲۹) مقامات قبرستان بن گئے۔ تقریباً ۳۵ لاکھ تو صرف بھوک سے مرے۔ دس فی صد یعنی ۱۲ لاکھ بے خانماں ہوئے۔ ساٹھ لاکھ غریب کہیں کے نہ رہے۔

۱۷ لاکھ زراعتی آبادی۔ ۱۵ لاکھ کسان۔ ۱۵ لاکھ گاؤں و صناع اور پچیس ہزار مدرسین کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ داستانِ غم ختم ہو گئی۔ جی نہیں۔ اس آفت پر بلائے آسمانی کا حال سنیئے۔ جب لوگ بھوکے ہو کر ہر اچھی بری چیز کھانے لگے۔ پہننے کو کپڑا نہ ملا۔ عورتیں چیتھڑے لگا کر پھرنے لگیں۔ پانی صاف نہ ملا۔ کھانا وقت پر میسر نہ آیا تو مختلف بیماریاں وباؤں کی صورت میں نمودار ہو گئیں۔ تانگیل، تاملوک، ڈائمنڈ ہاربر، ہگلی، نارائن گنج وغیرہ جیسے شہروں میں۔ ملیریا، کالرا، چیچک، پیچش نے وہ قیامت ڈھائی کہ لوگ سڑک پر چوہوں کی موت مرنے لگے، اور تقریباً ۱۲ لاکھ نفوس انسانی ان امراض کی نذر ہوئے۔ فرید پور، چٹگانگ، اکبر گنج، رنگ پور میں کالرا، پیچش نے قیامت برپا کر دی۔ ۱۹۴۴ء تک ان کا ایسا زور بندھا کہ خدا کی پناہ! امراض کے پھیلتے ہی دواؤں کی قیمت بڑھ گئی۔ حکومت کے کنٹرول کے باوجود بلاک مارکٹ کا زور ہوا۔ کونین جو ملیریا کی واحد دوا ہے۔ ۹۰ روپیہ فی پونڈ فروخت ہونے لگی۔ حالانکہ کنٹرول کی قیمت ۳۷ روپیہ فی پونڈ تھی۔ رپورٹ دینے والوں نے رشوت ستانی امرا کی سنگدلی اور مال داروں کے حرص و آز کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ "بنگال میں سوائے بلاک مارکٹ کے اور کوئی مارکٹ ہی نہ تھا!"

اس کیفیت کو پڑھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان دو سالوں میں بنگال پر کیا گزری۔ آہ یہ کہتے ہوئے میرا قلم کانپتا ہے کہ اس عبرت انگیز مصیبت کے باوجود بھی سنگدل انسان کا دل ابھی نہیں پسیجا۔ فرانس کا انقلاب، اور روس کا انقلاب بنگال کی اس تباہی کے مقابلے میں شاید حقیر ہو۔ بنگال کی داستان غم پڑھ کر یہ انقلابات افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ غریبوں کی یہ ہائے خالی نہ جائے گی۔ ان حالات میں ہندوستان ایک انقلاب کی ضرور صورت دیکھے گا۔ وہ

مردہ لاشیں جو بنگال کے گلی کوچوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان اینٹوں کا کام دیں گی جس سے انتقام کا خون آشام محل تیار ہوگا۔ اور سرمایہ داری، حرص و ہوس، ہنگدلی اور رشوت ستانی کے مجرم اپنے کرتوتوں کی سزا پائیں گے۔ تاریخ میں سراج الدولہ کی کال کوٹھڑی کا ذکر ہے۔ آج پورے بنگال میں کال ہے لیکن ——
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا!

سیاسی تبصروں نے قحط بنگال کی مختلف توجیہیں کی ہیں لیکن میں ان توجیہوں میں کوئی کام کی بات نہیں پاتا۔ میرے نزدیک خون انسان کا الزام خود انسان کے سر ہے خصوصاً وہ انسان جو ہم وطن تھے۔ ایک ہی ہوا میں سانس لیتے تھے۔ ایک ہی سورج کی روشنی پاتے تھے! اور ایک ہی زمین کی کھیتی سے اپنا پیٹ پالتے تھے لیکن تجارتی منڈیوں، زراعتی بازاروں، اور صنعتی کارخانوں کے مالک بن کر مردوں کی جانوں، عورتوں کی عصمتوں کو لٹتے ہوئے اور بچوں کی معصوم سانسوں کو اکھڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور اُف نہ کرتے تھے۔ یہاں انسان نے انسان پر عجیب ظلم ڈھائے ہیں۔ حرص اور زر پرستی کے نشے میں انھوں نے اپنی دولت پر سونے کی اینٹوں کا انبار لگانا چاہا اور غریبوں کا منہ مارا! میر شہریوں نے جی کھول کر رشوت دی سامان حاصل کیا۔ اور بلاک مارکٹ والوں کو بیباک بنا دیا۔ غریبوں کی وقت پر مدد نہ کی۔ کارواں کو لٹتا ہوا دیکھا۔ باہر سے مدد آئی۔ لیکن ان کا جذبۂ حُبِّ وطن بیدار نہ ہو سکا۔ اور بنگال مقامی امداد سے محروم ہی رہا۔

دیکھا آپ نے علمِ معاشیات کے قوانین؟ دیکھا آپ نے پیدائش دولت کے دست دراز؟ جنھوں نے کمزور انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اور ذرا نہ جھجکے۔ دیکھی آپ نے تنظیمی اداروں کی بے بسی؟ جو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک محلے سے دوسرے محلے، ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک

انسان سے دوسرے انسان کا ربط تک باقی نہ رکھ سکے، اور نفسی کی قیامت کو اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے ہوئے دیکھے۔

آئیے اس قیامتِ صغرا کا آخری سین بھی آپ کو دکھائیں۔

سڑکوں پر انسان دم توڑ رہے ہیں۔ اور دوکان میں گدّے پر بیٹھا سرمایہ دار مسکرا رہا ہے۔ گلی گلی میں بھوکوں کی کراہیں سنائی دے رہی ہیں، اور امیر لوگ کھڑکیاں بند کئے اپنی جان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ماں مر چکی ہے اور معصوم بچّہ اس کے سکڑے ہوئے سینے سے دودھ چوسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرا بھوکا انسان اس بچّے کو روند کر گزر جاتا ہے۔ گاؤں گاؤں شہر شہر امراض اور وبا کا زور ہے۔ لیکن دوا فروش دوائیں نہیں دیتے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ نوجوان لڑکے ننگی لڑکیوں کو تاک رہے ہیں۔ کم سن بچّے قرم ساق کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ماں بیٹی کا ہاتھ تھامے ہوئے اس کی جوانی کو کسی سپاہی کے حوالے کر رہی ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی عصمت لٹتے ہوئے دیکھ کر انجان ہو رہا ہے۔ جوق در جوق لڑکیاں فوجی اڈوں کی طرف جا رہی ہیں اور حاملہ ہو کر، امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہو کر واپس آ رہی ہیں۔ کارخانوں میں عورت کو پہلے عصمت بیچنی پڑتی ہے۔ پھر اجرت لینی پڑتی ہے! ان کے جسموں پر چیتھڑے لگے ہیں اور دھوتیاں، ساڑیاں اسّی (۸۰) روپے۔ نوّے (۹۰) روپے کو ایک فروخت ہو رہی ہیں۔ ناری سیوا سنگھا، کاہیلا آتمارکشا سمیتن۔ اور ہندوستانی عورتوں کی کانفرنسوں نے عورتوں کی عصمت اور عزت بچانے کے لیے کچھ خدمت کی لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔ اگر کئی انجمنیں اس قسم کی ہوں اگر کروڑہا روپے جمع کئے جائیں اور نیک دل انسان دیانت داری سے خدمتِ انسانی کا جذبہ لے کر آگے بڑھیں۔ تو ممکن ہے کہ چند سالوں میں ان بے خانماں

اور بے کار انسانوں کی کچھ اصلاح ہو سکے۔ اس وقت تو موت اور بے بسی کے ہاتھوں کا کھلونا بنے ہوئے اس طرح گھوم رہے ہیں۔ جیسے زہر کھائے ہوئے چوہے اور کتّے جان بچانے کے لئے موریوں اور گلیوں میں دوڑتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جو انسان ہو کر کتوں اور بلیوں کے منہ سے ایک ٹکڑا روٹی اور ایک پارہ گوشت چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

کیفی اعظمی

کلکتّہ

"کلکتّہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے"
(غالب)

رستوں پہ رینگتے ہوئے بھوکے ہزار جیف
غربت کا جاں گداز نظارا کہ ہائے ہائے

وہ خاک پر بلکتے ہوئے طفلِ جاں بہ لب
وہ ڈوبتا ہر ایک ستارا کہ ہائے ہائے

بچّے، جوان، عورتیں بے آس ہیں سبھی
آرام اس طرح سے سدھارا کہ ہائے ہائے

سڑکوں پہ وہ پڑی ہوئی بھوکوں کی میتیں
لاشوں سے پُر ہر ایک کنارا کہ ہائے ہائے

انساں ترس رہے ہیں نوالے کے واسطے
جینے کا یوں مٹا ہے سہارا کہ ہائے ہائے

ہوتی ہوئی تباہ وہ گنجان بستیاں
چڑھتا ہوا وہ قحط کا دھارا کہ ہائے ہائے

جلتے ہوئے وہ پیٹ وہ آنکھیں دھنسی ہوئیں
بھڑکا ہوا قضا کا شرارا کہ ہائے ہائے

وہ قحط و بے کسی وہ حکومت کی بے حسی
وہ تاجرانِ مست و خود آرا کہ ہائے ہائے

لٹکے ہوئے گداموں میں وہ قفلِ آہنی
وہ نفع کا ذلیل نظارا کہ ہائے ہائے

کیفی تڑپ اٹھی ہیں وطن کی جماعتیں
بھوکوں نے اس طرح سے پکارا کہ ہائے ہائے

ممتاز حسین جونپوری

ہاہاکار

"ڈاکٹر آرن نے بائیں ہاتھ سے چھری داہنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کیونکہ وہ رسمی صحبتوں میں غلط طور پر کانٹا چھری پکڑنے سے بہت گھبراتا۔ "آخر پت جھڑ میں درخت کیوں نہیں گر پڑتے"۔ ڈاکٹر اس تمام عرصے میں اپنی نئی بیوی کی ساڑی کے زرد پلّو کو دیکھ رہا تھا۔ جو پہاڑی چشمے کی طرح اونچی چوٹیوں سے گزر کر سینے کی گہری وادی میں پناہ لے رہا تھا۔ ہنسلیوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اسے بالکل ایک کھڈ کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس کھڈ کو بھرا نہیں جا سکتا ہے۔ اس نے اسی سوچ میں چائے کی پیالی میز پر رکھدی اور آرن کی طرف مخاطب ہو کر بولا "آرٹسٹ سبب نہیں دریافت کیا کرتے۔ وہ تو محض عکّاسی کرتے ہیں"۔

مس سنتوش اس ہلکے طنز پر مسکرائی اور کیک کے ایک بہت ہی چھوٹے ٹکڑے کو حلق کے نیچے اتار کر بولی "بات تو بڑی پکّی کہی۔ لیکن کیا ڈاکٹر واقعی اسباب دریافت کرتے ہیں"۔

"کیوں نہیں" نریندر نے ایک اعصابی حرارت کو روکتے ہوئے کہا کیونکہ اس کا پیر بالکل غیر ارادی طور پر مسز ڈاکٹر مکرجی کے پیر سے مس ہو گیا تھا۔ "اب تو ان لوگوں نے بھوکوں کا بھی علاج شروع کر دیا ہے۔ پھر وہ ایک

مصنوعی قہقہے کے ساتھ ہنسنے لگا اور ہوا میں بسکٹ کے ریزے دور تک اڑتے رہے۔ ڈاکٹر کی بیوی محفل میں بالکل نووارد تھی۔ اس لئے وہ اپنا وقت ارن کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن نریندر کے پیرنے اسے چوکنّا کر دیا۔ اور وہ ڈاکٹر کے رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ کیا انھیں برابر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس فکری لمحے میں اس کی آنکھیں کسی قدر جھک گئی تھیں جس پر لمبی لمبی پلکوں کی جھالر پڑی ہوئی تھی مس سنتوش کے دل میں وہ تمام پلکیں کانٹوں کی طرح چُبھ رہی تھیں کیونکہ اس نے بارہا کوشش کی لیکن اس کی پلکوں کو نہ بڑھنا تھا اور وہ نہ بڑھیں شاید انھیں پلکوں ہی کا قصور تھا کہ مس سنتوش نے اس قدر تیز جملہ کہا "کہیئے مسز کر جی آپ کس چیز کا علاج کرتی ہیں"۔

"چارہ گری تو آپ کا کام ہے"۔ پورا مجمع اس بے ساختہ جواب پر ہنس پڑا۔ کیونکہ مس سنتوش ایک نرس تھی۔ ڈاکٹر اس نوک جھوک کو فوراً تاڑ گیا۔ چنانچہ پوری محفل پر ایک کہر کی سی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اس نے ارن سے مخاطب ہو کر کہا "میں تمہارے اس سوال کا اب جواب دینا چاہتا ہوں درخت پتّوں کے سہارے زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی غذا جڑوں سے حاصل کرتے ہیں۔ جب تک وہ چھپی ہوئی رہتی ہیں۔ ہمیں ان کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جب طوفان الٹ دیتے ہیں تو میلوں زمین کے اندر چھتنار زندگی کا پتہ چلتا ہے"۔ سامنے کیک سے بھری ہوئی پلیٹ کو دور کر دیا "پتھر پر دوب نہیں جمتی۔ لیکن گھوڑوں پر گلاب اُگ آتا ہے"۔

باہر ہوا بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ کمرے کی تمام تصویریں الٹنے پلٹنے لگیں۔ مس سنتوش کے بال ہوا میں الجھ الجھ کر لڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر کی

بیوی ریشمیں بلاؤز میں بغلوں کے نیچے چپچپاتی ہوئی ہوا کو محسوس کر رہی تھی اس کی نظریں کبھی ارن کے گھونگھر والے بال اور خمدار ابروؤں پر پڑتی تو کبھی ان تصویروں پر جنھیں ارن نے بنایا تھا۔ جو زیادہ تر عریاں تھیں۔ ارن تیز ہوا کے جھونکوں میں اپنے تخیل کو مدد پہنچا رہا تھا۔ مسز مکرجی کے ہلتے ہوئے پلوؤں کے نیچے اُسے وہ تمام دائرے اور خم نظر آ رہے تھے جو ایجنٹا اور ایلورا کے فن کا مبالغہ آمیز حصّہ ہے۔ اسے ایلورا کے مندر کا وہ مجسّمہ بھی یاد پڑ گیا جہاں شیو اپنی ٹانگوں کا کمان بنائے پاربتی کے ضخیم پستانوں پر انگلیاں جمائے مسکرا رہا ہے۔ آخر اس میں روح کی کونسی پرواز ہے جو ہمیں مادے کی کثافت سے پاک کر دیتی ہے۔ یہ گز بھر کپڑا بھی کتنا عارضی نقاب ہے۔ ہوا کے ایک جھونکے میں کبھی پھول کر بادبان بن جاتا ہے۔ تو کبھی جسم کی سطح سے چمٹ جاتا ہے۔ طوفانی موسم کے لئے کوئی اور لباس چاہیئے جو خود اپنے کو سنبھال سکے۔ مسز مکرجی بھی جارجٹ کی کمزوری محسوس کرنے لگی تھی۔ کیونکہ ہوا کے ساتھ اب کچھ بارش کے قطرے بھی آنے لگے تھے۔ اس نے ارن بابو سے اجازت چاہی "کیا میں کھڑکیاں بند کر سکتی ہوں۔"

"بہت خوشی سے۔" ارن نے جواب دیا۔ اور کرسیوں کے گرداب سے اٹھتی ہوئی لہر کو بغور دیکھنے لگا۔ کولھوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں اور لمبی پتلی ٹانگوں میں اسے قدیم ہندوستانی آرٹ کا کایا پلٹ نظر آیا۔ ان کے تمام ہی مجسمے اور تصویریں بھری بھری ٹھگنی پنڈلیوں سے شروع ہو کر گاؤدم ملوان کولھوں پر ختم ہوتی ہیں۔ لیکن اسے اس بدلی ہوئی ساخت میں بھی ایک لذت محسوس ہوئی۔ جب ڈاکٹر کی بیوی اپنی جگہ پر واپس آ کر بیٹھ گئی تو ارن نے اپنے تازہ ترین شاہکار کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ڈاکٹر صاحب

آپ نے اس تصویر کو دیکھا۔ ڈاکٹر نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور نہایت بے رُخی کے ساتھ بولا۔ یہ لنگر خانہ ہی تو ہے۔ یہاں کے بعد پھر میرے ہسپتال میں آتے ہیں۔"

"جہاں" نرنیدر نے ڈاکٹر کے جملے کی کڑی کو جوڑتے ہوئے کہا "ان کی بھوک کا علاج کیا جاتا ہے۔" اور پھر وہ مصنوعی ہنسی ہنسنے لگا۔

ڈاکٹر کوئی عملی سیاست داں تو نہ تھا۔ لیکن نظریاتی مبحثوں میں کبھی سر جھکا کر نہیں بیٹھا تھا۔ "نرنیدر میری زبان نہ کھلواؤ۔ ورنہ مجھے کہنا پڑے گا کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو آزادی کا خواب بھوک کے سینوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔" مس سنتوش جملے کے رخ سے سمجھ گئی کہ اب پالٹیکس کی بحث کا دروازہ کھلنے والا ہی ہے۔ جس سے اس کو قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اس نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے ارن سے پوچھا۔ "آپ کی یہ تمام تصویریں عریاں کیوں ہیں۔ کیا قحط کا اثر محض جسم تک ہی محدود ہے؟"

مس سنتوش کبھی تو ہمیں اس کا موقع دیجئے کہ ہم جسم و جان کی دوئی کا پتہ چلا سکیں۔ یہی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ ان میں گوشت بھر دیجئے میں کہتا ہوں خالی ہوا بھر دیجئے۔ آپ کو حسین معلوم ہونے لگیں گی۔ اور آنکھوں میں ایک روحانی چمک پیدا ہو جائے گی۔ آخر یہ تو معلوم ہو سکے کہ آنکھوں میں کب چمک پیدا ہوتی ہے۔ اور کب ویران ہو جاتی ہیں۔ کتنی لاشیں ہیں جن کو کفن میں ڈھانک دینے سے اس کا مرض چھپ جاتا ہے۔ لیکن یہ تو ابھی زندہ ہیں۔ کبھی کبھی ہماری تہذیب کا غازہ تیز سیلابوں میں اتر جاتا ہے۔"

جب ارن اپنی بات ختم کر چکا تو ڈاکٹر نے کیلے کی چھلی پھیلتے ہوئے کہا "بس تمہارا مشاہدہ ختم ہو گیا۔ اب مجھے نرنیدر کے چبھتے ہوئے فقرے کا جواب

دینے دو مسٹر نریندر" پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ کیونکہ باہر بجلیوں کی کڑک اور تیز ہوا کی سرسراہٹ انھیں محفوظ چھتوں کے نیچے خائف کر دیتی۔ مس سنتوش اکثر سہم کر ڈاکٹر کی کرسی کا سہارا لینا چاہتی۔ لیکن مسز مکرجی کی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ اسے اپنی جگہ پر قائم رکھتا۔ نریندر اپنے ذہن میں قحط کے موضوع پر ایک زبردست تقریر تیار کر رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کے مخاطب کرنے پر اس کے تخیل کے تمام تار و پود ٹوٹ گئے۔ اور وہ ہاتھ میں کانٹا لئے غور سے اس کی طرف تکنے لگا۔ ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "حکومت وقت مجھ سے سماجی امراض کا علاج کرانا چاہتی ہے۔ میں اسے حماقت سمجھتے ہوئے بھی اپنے فرض کو انجام دے رہا ہوں۔ اس حقیقت کا انکشاف ایک مریض کے ایک جملے سے ہوا جس کو سننے کی زحمت دینا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر ایک کیلا ختم کر چکا تھا۔ اور یہ دوسرا کیلا کھانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے بالکل غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ روک لیا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ انسان فاقے سے پہلے بہت ہی تندرست اور توانا ہوگا۔ کیونکہ اس کی کلائیوں کی جوڑی ہڈیاں اور خشک گوشت کے بٹے ہوئے عضلات ایک مضبوط کاٹھی کا نشان دے رہے تھے۔ متواتر فاقوں کی وجہ سے اس کی آنتوں میں زخم پڑ گئے تھے۔ جنھیں مجھے ٹانکنا پڑا۔ لیکن وہ ان تمام سختیوں کو جھیلتا رہا۔ ڈاکٹر کے سگریٹ کا ایک چوتھائی حصّہ جل چکا تھا۔ لیکن اسے گرد جھاڑنے کا بھی خیال نہ رہا۔ پورا مجمع غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی میز پر اپنی کہنی ٹیک کر ہتھیلی پر رُخسار رکھے ہوئے تھی۔ مس سنتوش سوچ رہی تھی یہ واقعہ اس نے آج سے پہلے کیوں نہیں بیان کیا تھا۔ ڈاکٹر نے خاکدان میں راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "میں نے اس سے ایک نہایت ہی اضطراری حالت میں پوچھا "آخر تو یہ سختیاں

کس کے لئے جھیل رہا ہے۔ آپ یقین کیجئے میں اپنے سوال پر بڑا نادم ہوا۔ وہ کہنے لگا۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔ میں سب کو چھوڑ چکا ہوں۔ زندگی بذاتِ خود ایک جبر ہے جو چھوڑتے نہیں بنتی۔ میں فوراً اس کے پلنگ سے ہٹ گیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں اسے یہ خبر سنانے کے لئے گیا کہ آج تم ہسپتال سے برخاست کئے جاتے ہو۔ تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے اور وضاحت کے ساتھ کہا کہ اب تم اچھے ہو گئے۔" ڈاکٹر کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں اور نظروں میں ایک عجیب کا احساس پیدا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی کو بھی نہ پہچان رہا ہو۔ ایک سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس کا نچلا ہونٹ نیچے کی جانب جھک گیا۔ اور اوپر کے ہونٹ میں بائیں جانب ایک ہلکا سا خم پیدا ہوا جس سے محض ایک ادھورا سا جملہ باہر نکلا "نہیں ڈاکٹر صاحب" ڈاکٹر بالکل خاموش ہو گیا اور وہ کرسی میں اس طرح کروٹ بدلنے لگا جیسے وہ اٹھ کر بھاگ جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ یکایک ڈرائنگ روم کے دروازے کو ایک شدید صدمہ پہنچا اور وہ اس طرح دو ٹکڑ کھل گیا جیسے کسی منہ بند مٹھوڑے کو اندر سے کاٹ کر کشادہ کر دیا گیا ہو۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ بھوکے جانوروں کا، ایک پورا غول گھس آیا۔ وہ سب کے سب انسان تھے۔ پانی میں لت پت ان میں بوڑھے، بچے، جوان سبھی شامل تھے۔ وہ کل سات عدد تھے۔ جس میں ایک عورت بھی تھی جس کی عمر کا اندازہ مشکل تھا۔ لیکن برسات کا پانی مٹے ہوئے نقوش کو پھر سے اُجاگر کر رہا تھا۔ الجھے ہوئے مٹیالے بال پانی میں دھل کر سیاہ اور چمکدار معلوم ہو رہے تھے۔ بغلوں کے پاس سے اڑسی ہوئی دھجیوں میں ایک دائرہ نظر آ رہا تھا۔ جو غبارہ کی طرح پھول کر پچک گیا تھا۔ پچکا ہوا پیٹ ناف کے خم کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔ لیکن سوکھی ہوئی پنڈلیوں اور

رانوں میں اب بھی ایک تناسب باقی تھا۔ باوجود ان نشانیوں کے وہ سب کے سب بچے یا بوڑھے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آمد ایک ایسے خطرے کی گھنٹی تھی جو مہذب انسانوں کو لوکھلا دیا کرتی ہے۔ کرسیوں پر کرسیاں گرنے لگیں ساڑیاں پیروں سے الجھ کر جا بجا مسک گئیں اور پلّو شانوں سے گر کر سدراہ بننے لگا۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی ایک کونے سے چمٹ گئے۔ مسز مکرجی اپنے شوہر کی مضبوط باہوں کا اس طرح سہارا لے رہی تھیں جیسے وہ خود کسی غلط بنیاد پر کھڑی ہیں۔ مس سنتوش کئی بار سہارے کے لئے ٹکرائی۔ بالآخر مسز مکرجی کے پاس سرک آئی۔ آرن اور نریندر ایک الماری سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سب کے سب اپنی جگہ پر مبہوت اور ساکت تھے۔ ان میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کس قسم کی آواز نکالنی چاہیئے۔ آخر چور چور کہہ کر کیوں نہیں پکارا جا رہا ہے۔ وہ میز کے فضلے کو اس طرح صاف کر رہے تھے جیسے بھوکے گدھ کسی تازہ لاش پر اتر آئے ہوں۔ کیک، بسکٹ، پیسٹری، انڈے کیلے وہ سب کو ایک ساتھ منہ میں ٹھونستے جا رہے تھے۔ کبھی وہ دہانوں سے باہر پھسل پڑتے تو کبھی حلق کے تنگ راستے میں گھٹنے لگتے۔ پلیٹیں زبانوں سے چاٹ گئے اور خوردہ مٹھیوں میں رکھ کر پھانک گئے۔ جب اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو کیلے کے چھلکوں ہی کو چاٹنے لگے جب وہ تمام چیزیں ختم کر چکے تو ایک بوڑھا نوجوان قہقہے مار کر ہنسنے لگا اور جب کافی ہنس چکا تو ڈاکٹر کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "ڈرتے کیوں ہو۔ آؤ آؤ بیٹھو، باتیں کریں۔ تم بھی آؤ مس سنتوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی محبت کے قصّے سنائیں اور یہ بچّہ کیا تم لوگوں کے پاس کوئی بچّہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دو انگلیوں سے سیٹی بجائی اور پورا جتھا چلتا بنا

گو کہ بارش ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ہوا اب بھی تیز تھی۔ کالے کالے بادل سیہ مست ایک دوسرے کو ریلتے ٹھیلتے ہوا کے دوش پر بھاگے جا رہے تھے کہیں کہیں پر سورج کی ایک آدھ ڈوبتی ہوئی شعاعیں ان تیرہ و تار بادلوں کے کناروں کو شنجرفی یا بنفشئی رنگوں میں رنگ دیتیں۔ لیکن ایک ہی آدھ منٹ میں وہ رنگین جھالر بھی ٹوٹ جاتی۔ بہتی ہوئی نالیوں میں کتے اپنی غذا تلاش کر رہے تھے۔ اور ڈاکٹر معہ اپنی بیوی کے گردن جھکائے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا۔ موٹر، ٹرام، بس سبھی پاس سے گزرتیں۔ لیکن وہ کسی کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتا مشن روڈ کے چوراہے پر پولیس کا ایک جتھا کلکتے کو فاقہ کشوں سے صاف کر رہا تھا۔ وہ سب کے سب ایک ایک قطار میں رسن بستہ ایک اونچی سڑک پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر کے دماغ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ انھیں مجرم سمجھ کر چوراہے کو پار کر گیا جب وہ اپنے مکان کے سامنے والے میدان میں پہنچا تو ایک بہت بڑے پیپل کے درخت کو زمین پر گرا ہوا دیکھا جس نے اپنی موت سے پورے راستے کو گھیر رکھا تھا۔ اسے خواہ نخواہ پیچ و خم کھا کر جانا پڑا، الجھی ہوئی قطار اندر قطار جکڑی ہوئی بٹی ہوئی جہاز کی رسیوں سے بھی زیادہ موٹی اور دماغ کی رگوں سے زیادہ باریک جڑیں زمین کا سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑی تھیں اور بالکل ایک بیسوا کی طرح اپنی عریانی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر زمین کے کھلے ہوئے زخموں کے درمیان سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی جڑ بھی اس کو گرا دینے کے لئے کافی تھی بایں ہمہ وہ ایک ہاتھ سے اپنی بیوی کو بھی تھامے تھا!

رام پرکاش اشک

بنگال

تیرے بڑوں کی ریت یہی ہے
اس بازی کی جیت یہی ہے
مرجا طمینان سے مرجا ——— اے بھوکے انسان
اے بھوکے انسان

چاول کے انبار لگے ہیں
گیہوں کے گودام بھرے ہیں
تو اور ان پر ہلّے بولے ——— یہ نہیں تیری شان
اے بھوکے انسان

عقل سے کوئی کام نہ لینا
اس دستور کا نام نہ لینا
تو ہے بھارت ورش کا باسی ——— رشیوں کی سنتان
اے بھوکے انسان

راہوں پر بے کھٹکے مرجا
نام خدا کا رٹ کے مرجا
خاموشی سے مرجانے میں ——— ہے تیرا کلیان

اے بھوکے انسان

تجھ کو روٹی کی کیا حاجت؟
تو کیوں مانگے دھن اور دولت ؟
تیرے گھر میں وید پڑے ہیں رکھا ہے قرآن
اے بھوکے انسان

سومناتھ لہری

لاشوں کی قطاریں

بیچ کی تصویر کتنی بھیانک ہے۔ درخت کے سائے میں ایک لاش پڑی ہے۔ چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ہوا اور بارش کے سوا کوئی اس لاش کا پرسانِ حال نہیں۔ جب اس کی تصویر لی گئی تو پانی برس رہا تھا۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ لاش بردوان کے سیلاب زدہ علاقے کی ہے۔ دراصل یہ لاش کلکتے کی ہے۔ جو سیالدا اسٹیشن کے پاس سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پڑی ہوئی تھی۔ جب ہم یہ تصویر لے رہے تھے تو بہت سے آدمی اس لاش کو دیکھتے ہوئے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے آدمی گزر چکے ہیں۔

اب کلکتے کی سڑکوں پر ایک دو لاش کا پڑا ہونا معمولی بات ہے۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس کی رپورٹ ہے کہ ۲۱۔ اگست تک ایک ہفتے کے اندر پانچ سو دم توڑتے ہوئے آدمی ہسپتال پہنچائے گئے جن میں چالیس مر گئے۔ رپورٹ میں ان کا ذکر نہیں جو سڑک پر پڑے پڑے مر گئے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ یہ لاش کس کی ہے۔ لیکن جو لوگ ابھی مرے نہیں ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں علم ہے۔ وہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی مصیبت بجائے خود ایک داستان ہے۔ یہ داستان پورے ایک طبقے کی تباہی کی داستان ہے۔ اچھے خاصے تندرست اور توانا

کسان کس طرح موت کا شکار ہو رہے ہیں۔

لاش سے ذرا دور ہٹ کر کچھ لوگ بیٹھے کھانا پکا رہے ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد، اس کی بیوی، بچے، اور اس کا ایک رشتے دار۔ دھوپ اور بارش سے پناہ لینے کے لئے ان کے پاس صرف ایک چھتری ہے۔ رات کے وقت بھی ان کے سروں پر اسی چھتری کا سایہ رہتا ہے۔ یہ لوگ کافی تندرست معلوم ہوتے ہیں شاید اس لئے کہ یہ لوگ اس سڑک پر ابھی پرسوں آئے ہیں۔ وہ مگرا کے گاؤں (ضلع ہگلی) میں کھیتوں پر مزدوری کرتے تھے۔ اس موسم میں وہ عام طور سے بیکار رہتے ہیں۔ اس سال ان کے پاس کھانے کو بھی نہیں تھا۔ دو مہینے ہوئے وہ غذا کی تلاش میں کلکتے آئے تھے۔ اپنے دس بارہ دیہاتی بھائیوں کے ساتھ ان کی ساری پونجی ایک مہینے میں ختم ہو گئی۔ دوسرے مہینے وہ بھیک مانگتے رہے بیوی دن رات غلے کی دوکان کے سامنے قطار میں کھڑی رہتی تھی کہ کسی طرح ایک سیر چاول مل جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ دوسرے مہینے مکان کا کرایہ نہیں دے سکتے تھے۔ کل جب وہ گھر لوٹ کر پہنچے تو مالک مکان نے وہاں تالا ڈال رکھا تھا۔ اور ان کے مٹی کے برتن اور تھالیاں باہر پھینک دی تھیں۔ انھیں دن بھر بھیک مانگنے کے بعد پانچ چھ آنے ملتے ہیں جن سے وہ مقررہ قیمت پر ایک سیر چاول خرید سکتے ہیں۔ وہ بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ اس ایک سیر چاول پر اس پورے خاندان کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ وہ دن میں صرف ایک وقت کھاتے ہیں۔

"تم کھانا لینے لنگر خانے میں کیوں نہیں جاتے۔" میں نے پوچھا۔

"وہاں بڑے دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ڈبل پیسہ تو مانگ سکتے ہیں پکا ہوا کھانا کیسے مانگیں ہم کھیت مزدور ہیں۔ فقیر نہیں ہیں کیا تم ہمیں کہیں

کام دلا دو گے بابو ؟"

کھیت مزدور بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی خودداری ابھی باقی ہے۔ وہ ایمانداری سے محنت کر کے ملک کے لئے غلّہ پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن ملک پر بے بسی اور پست ہمتی چھائی ہوئی ہے۔ آج یہ حالت ہو گئی کہ بنگالی کھیت مزدوروں کا ایک پورا خاندان سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا کھانا پکا رہا ہے۔ تھوڑی دور پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ یہ فاقہ کشی کا شکار ہے۔ کیا خبر کل اس خاندان کی لاشیں بھی یہیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔

* * * *

ہم نے خودداری کا ایک اور مظاہرہ دیکھا۔ لیکن یہ درمیانی طبقے کی غلط قسم کی خودداری تھی۔ بعض مارواڑیوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ امداد کے طور پر ضرورت مند خاندانوں کو جن کی آمدنی بیس روپے فی کس سے زیادہ نہیں ہے پندرہ روپیہ من چاول مہیّا کریں گے۔ اس کے لئے عوامی غذائی اور حفاظتی کمیٹی (جن رکھشا) کے والنٹیروں نے مردم شماری کر کے اعداد و شمار لینے شروع کئے۔ ایک صاحب جن کے خاندان میں آٹھ نو آدمی تھے اور جن کی آمدنی ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار تھی۔ والنٹیروں پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے۔ "تمہیں میری آمدنی معلوم کرنے کا کیا حق ہے ؟" والنٹیروں نے بڑی سنجیدگی سے انھیں سمجھایا کہ اس میں انھیں کا فائدہ ہے۔ انھوں نے بگڑ کر کہا مارواڑیوں سے میں کسی قسم کی خیرات نہیں چاہتا۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ وہ شام کو گایوں کو چار آنے کی کھجوری کھلا کر اپنی دن بھر کی بے ایمانی اور دھوکے بازی کو دھونا چاہتے ہیں۔ مجھ سے بحث مت کرو۔ سورج مل ناگر مل موٹے موٹے مارواڑی ہیں جنھوں نے شردھانند پارک میں لنگر خانہ کھولا ہے۔ کیا یہ

وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے سمبل پور اور دوسری جگھوں سے ہزاروں من چاول کوڑیوں کے مول خریدا ہے اور اب اسی چاول کو ہمارے ہاتھ سونے کے بھاؤ بیچ رہے ہیں؟ اگر تمہیں یقین نہیں تو جانے دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں خیرات نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ سرکاری دوکان سے سستا چاول ملے۔ اگر یہ وزارت اور حکومت ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتی تو یہ بیکار ہے۔ یہ سب اس لیگی وزارت کا کیا دھرا ہے۔"

ہمارے والنیٹروں نے کہا کیا حق کی وزارت اس سے بہتر تھی؟ کیا کوئی وزارت اس وقت تک غذائی مسئلے کو حل کر سکتی ہے جب تک تمہارے جیسے محبّان وطن عوامی غذائی کمیٹیوں میں کام کر کے عوام کو متحد اور منظم نہ کریں گے؟"

"ہاں یہ کام بُرا نہیں ہے۔ لیکن میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں ہے۔ لیکن تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ جب تک یہ انگریزی حکومت ختم نہ ہو گی۔ تب تک کوئی وزارت اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ حکومت تو ہمارے سینے پر سوار ہے۔ اتنا اندولن ہوا۔ توڑ پھوڑ ہوئی۔ لیکن انگریزی راج ویسے ہی قائم ہے سبھاش بابو کے وعدے بھی کہ وہ فوج لے کر آ رہے ہیں۔ سب یونہی تھے۔ اب تک تو کچھ ہوا نہیں۔ رہ گئے کمیونسٹ تو وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ بھی حکومت کے پٹھو ہیں۔"

"پھر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔" ایک والنیٹر نے پوچھا۔

"کیا کیوں نہیں جا سکتا۔ ہم مر سکتے ہیں! اس سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔"

اس مکالمے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی وطن دشمن جاپانی ایجنٹ کی باتیں تھیں۔ یہ ایک ایسے ہندوستانی کی باتیں تھیں جس کی تمام امیدیں مر چکی ہیں اور اب اس کی زندگی میں صرف تلخی باقی رہ گئی ہے۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جسے میں آفیشل کانگرس لیڈر، کیرتن شنکر رائے کی تقریر سن رہا ہوں۔ یہ تقریر انھوں نے اس کانفرنس میں کی تھی جو وزارت کی طرف سے غذائی مسئلے کے سلسلے میں بلائی گئی تھی۔ انھوں نے ملک کی مصیبت اور اپنی بے بسی کی تصویر کھینچ دی۔ اور آخر میں کہا کہ ہم مرجانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تقریر بڑی مضحکہ خیز تھی۔ لیکن اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں عوام کی طاقت پر بالکل بھروسہ نہیں رہ گیا ہے۔

* * * *

مجھے ایک خط یاد آگیا۔ جو فرید پور سے ایک کامریڈ نے بھیجا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ

ایک بھوکا لڑکا کئی دن سے بازار میں پڑا ہوا تھا۔ بھوک کی وجہ سے وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ رات کے وقت ایک گیدڑ اس کا آدھا داہنا پیر کھا گیا۔ وہ نیم مردہ حالت میں کئی دن وہیں پڑا رہا۔ کسی نے اسے نہیں اٹھایا۔ کل رات کو گیدڑوں نے اس کے ہاتھ پیر اور آنتیں کھالیں اس کی کمزور اور نحیف آواز کسی نے نہیں سنی۔ صبح لوگوں نے بازار میں اس کی لاش پڑی ہوئی دیکھی جو آدھی گیدڑ کھا چکے تھے۔"

کیا ہماری ساری قوم اس بدنصیب لڑکے کی طرح بے بس ہے؟

میرے بدن میں غصّے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کیا اب بھی محبّانِ وطن سوتے رہیں گے۔ کیا وہ اب بھی میدان عمل میں نہیں آئیں گے؟ کیا ہم حکومت کو برا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے؟

میری ذہنی کشمکش درمیانی طبقے کے محبّ وطن کی ذہنی کشمکش کی طرح تھی یہ کشمکش اپنی اصل صورت میں ڈاکٹر شیاما پرشاد کے یہاں پوری طرح

نمایاں ہے۔ وہ اپنے دل میں اہلِ وطن کا درد محسوس کرتے ہیں۔ عوام کی مصیبتیں انھیں اکساتی ہیں۔ وہ امدادی کمیٹی کے پاس جاتے ہیں۔ وزارت کے پاس جاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ لیکن پھر ان میں لیگ کی طرف سے مخالفت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے وہ سوچتے ہیں کیا عوام کی مصیبتیں دور کرنے کے لئے اپنے فرقے وارانہ مفاد کو ترک کر کے لیگ سے اتحاد کر لینا چاہیئے؟ ہرگز نہیں۔ ذخیرہ اندوزوں سے غلّہ حاصل کرنے میں وزارت کی مدد کرنی چاہیئے؟ ذخیرہ اندوز کہاں ہیں۔ سارا چاول تو لڑائی پر چلا گیا۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت کا پردہ فاش کرنا چاہیئے۔ غرض شیاما پرشاد اس طرح سوچتے رہے اور ہندو مہا سبھا نے ایک تجویز پاس کر دی جس میں یہ اشارہ تھا کہ شاید جاپانی فاشست بنگال کے لئے برما سے چاول بھیج دیں۔

اس حماقت پر ذخیرہ اندوز چپکے چپکے ہنستا ہے۔ اور جاپانی سنگاپور میں بغلیں بجا رہے ہیں..... لیکن عوام سڑکوں پر گر کر مر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر شیاما پرشاد پھر بھاگتے ہیں ـــــ لنگر خانے ـــــ چندہ۔

کیا کلکتے کے محبانِ وطن یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کی کوششوں سے کتنا اچھا نتیجہ نکل سکتا؟ ایک مہینے سے کم مدت میں بنگال کی امدادی کمیٹی نے سات لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیا۔ لنگر خانے کھل گئے ہیں۔ جہاں ہزاروں آدمیوں کو مفت یا برائے نام قیمت پر غذا ملتی ہے۔ کئی اور جماعتیں مثلاً عوامی حفاظتی کمیٹی (جن رکھشا سمیتی) وکیلوں کی کمیٹی) اور لیگ کے لنگر خانے بھی اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہزاروں والنٹیر کام میں لگے ہوئے ہیں۔

کام بڑھ رہا ہے۔ نئی نئی جماعتیں اٹھ رہی ہیں۔ زیادہ روپیہ اور زیادہ غذا آ رہی ہے۔ ہر طبقے کے آدمی امدادی کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

(آگ دینے والا) بھی اتنی لاشوں کو چتا میں نہیں لٹا سکتا۔

* * * *

ہم شہر لوٹ آئے۔ ہمارے پیر تھکن سے دکھ رہے ہیں۔ ہمارے ہی نہیں آج ہزاروں آدمیوں کے پیر دکھ رہے ہیں۔ ہزاروں مرد، ہزاروں عورتیں۔ بچے ماؤں کے خشک سینے سے دودھ پینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماؤں کے سینے میں دودھ نہیں رہ گیا ہے۔ بچے ان کا خون پی رہے ہیں۔ مائیں کھانس رہی ہیں اور خون تھوک رہی ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے کانپتے ہوئے پیروں پر اپنے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر گر پڑتی ہیں۔ ان کا خون محبانِ وطن کی گردن پر ہے! ان کو بچانے کی ذمہ داری محبان وطن پر ہے۔

یہ خانہ بدوش چاروں طرف سے کلکتے میں آ رہے ہیں۔ کسانوں کا پورا طبقہ اپنی زمین چھوڑ چھوڑ کر کھانے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ ملک کی معاشی زندگی خطرے میں ہے! اگر محبانِ وطن نے انھیں زیادہ غذا پیدا کرنے کے لئے ضروری سامان نہ دیا۔ تو سارا ملک معاشی بدحالی کا شکار ہو جائے گا۔

یہ سب جیتے جاگتے انسانوں کی نہیں۔ لاشوں کی قطاریں ہیں۔ سرکاری دکانوں کے سامنے، سڑکوں پر، اسٹیشنوں کے پاس، بستیوں کے جھونپڑوں میں، درمیانی طبقے کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ہر جگہ لاشوں کی قطاریں لگی ہیں۔ سب اپنی اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔ دو وقت کھانے کے بجائے ایک وقت کھانا ایک وقت کھانے کے بجائے فاقہ۔ فاقے کی بدولت یہ سڑکوں پر آ جاتے ہیں۔ کوڑے کے ڈبوں میں کھانا تلاش کرتے ہیں اور پھر رات کے وقت کسی کونے میں گر کر مر جاتے ہیں۔

صرف محبانِ وطن انھیں بچا سکتے ہیں۔

(آگ دینے والا) بھی اتنی لاشوں کو چتا میں نہیں لٹا سکتا۔

* * * *

ہم شہر لوٹ آئے۔ ہمارے پیر تھکن سے دکھ رہے ہیں۔ ہمارے ہی نہیں آج ہزاروں آدمیوں کے پیر دکھ رہے ہیں۔ ہزاروں مرد، ہزاروں عورتیں۔ بچے ماؤں کے خشک سینے سے دودھ پینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماؤں کے سینے میں دودھ نہیں رہ گیا ہے۔ بچے ان کا خون پی رہے ہیں۔ مائیں کھانس رہی ہیں اور خون تھوک رہی ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے کانپتے ہوئے پیروں پر اپنے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر گر پڑتی ہیں۔ ان کا خون محبانِ وطن کی گردن پر ہے! ان کو بچانے کی ذمہ داری محبان وطن پر ہے۔

یہ خانہ بدوش چاروں طرف سے کلکتے میں آ رہے ہیں۔ کسانوں کا پورا طبقہ اپنی زمین چھوڑ چھوڑ کر کھانے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ ملک کی معاشی زندگی خطرے میں ہے! اگر محبانِ وطن نے انھیں زیادہ غذا پیدا کرنے کے لئے ضروری سامان نہ دیا۔ تو سارا ملک معاشی بدحالی کا شکار ہو جائے گا۔

یہ سب جیتے جاگتے انسانوں کی نہیں۔ لاشوں کی قطاریں ہیں۔ سرکاری دکانوں کے سامنے، سڑکوں پر، اسٹیشنوں کے پاس، بستیوں کے جھونپڑوں میں، درمیانی طبقے کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ہر جگہ لاشوں کی قطاریں لگی ہیں۔ سب اپنی اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔ دو وقت کھانے کے بجائے ایک وقت کھانا ایک وقت کھانے کے بجائے فاقہ۔ فاقے کی بدولت یہ سڑکوں پر آ جاتے ہیں۔ کوڑے کے ڈبوں میں کھانا تلاش کرتے ہیں اور پھر رات کے وقت کسی کونے میں گر کر مر جاتے ہیں۔

صرف محبانِ وطن انھیں بچا سکتے ہیں۔

کامریڈ احمد ریاض

بنگال کی کہانی

میں نے دیکھا نونہالانِ چمن کا بانکپن
میں نے دیکھا شاعرِ بنگال کا عہدِ عروج

میں نے دیکھے راستوں میں جبینوں کے ہجوم
میں نے دیکھی عہدِ گُل کی دلکشی نازونکی دھوم

گود میں میرے پلے نغمہ نوازانِ حیات
آج تک سینے میں ہیں محفوظ خونیں معرکے

میرے ان ہاتھوں میں کھیلے ہیں شہیدانِ وطن
ہیں بہت بیباک میرے غزالانِ چمن

آج لیکن اک بھیانک حادثے کا ہوں شکار
ہر طرف لاشوں کے منہ پر ایک روٹی کی پکار

بھوک رقصاں قحط خنداں اور وبائیں الاماں
بک رہی ہیں آج حوّا کی کنواری بیٹیاں

آج مشرق کے تقدس کے محافظ ہیں کہاں
آج کیوں عُریاں ہیں دوشیزاؤں کے سیمیں بدن

لُٹ رہا ہے آج کیوں لاکھوں حسینوں کا سُہاگ
آج کیوں منڈلا رہے ہیں میری ہی چھاتی پہ ناگ

رہنمایانِ وطن کو کاش دکھلائے کوئی
کون ہے جس نے غریبوں پر کیا ہے رزق بند؟

نسلِ آدم کی یہ ویرانی یہ سسکے کا نظام
جبر کے ہاتھوں میں کس نے دی حکومت کی لگام

شاہین فاروقی

فراری

اور عتیق کتنی ہی دیر تک موتیا رنگ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی بھوری آنکھوں والی کو دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے انتہاہ ساگر سے کوئی جل پری آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ دور نظر دوڑاتے ہوئے بولا ——— زندگی ایک حسین خواب ہے! یہ ٹھنڈی پون، یہ نیلا امبر اور ادھر ادھر منڈلانے والے رومانی بادل، تمہاری طرح کی دوست ——— REALLY! LIFE IS A JOY شہناز کیا کہنا چاہتی تھی۔ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ وہ کسی میٹھے سپنے میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی ایسی منزل ہے جس کے راستے میں گلاب کے پھول بکھرے ہوئے ہیں!

کیوں؟ کون جانے؟ مگر اس نے لکھتے لکھتے قلم روک لیا، لکھی ہوئی سطروں پر ایک بار نگاہ ڈالی ——— ایسی نگاہیں جیسے ماں اپنے نومولود بچے کو دیکھتی ہے! کہانی کے ہیرو کی جگہ وہ خود اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ اور ہیروئن؟ شہناز ——— شہناز؟ دوسری کون ہو سکتی ہے!

بس ایسی ہی کہانی لکھنی چاہیئے، سب واہ، واہ کرنے لگیں۔ اور شہناز؟ بس وہ تو رقص کرنے لگے گی۔ کالج کی زندگی کو ایک نہایت ہی رنگین انداز میں پیش کروں گا! رومانی داستان، حسن و شباب کی چھیڑ چھاڑ!

جب سے وہ انٹر میں داخل ہوا۔ افسانے لکھنے لگا، ہر شخص کا خیال تھا کہ

واقعی آئندہ نسل کا بہت بڑا لکھنے والا ہوگا۔ ایک مشہور ادبی شخصیت کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔ اور شہناز کی محبّت اس کی زندگی میں نت نئے رنگ بھر دے گی۔

——— برآمدے میں کھڑے ہو کر شہناز نے دور نظر ڈالی، شام کا وقت تھا، وداع ہونے والے عاشق کی نگاہِ واپسیں کی طرح سورج کی کرنیں سطح زمین پر جھول رہی تھیں، دور میدان میں چند لڑکے کھیل رہے تھے ایک ہی لمحے کے لئے شہناز کی نگاہوں میں دوپہر کا واقعہ گھوم گیا۔ دوپہر میں کھانے کے بعد وہ پورچ میں کھڑی ہوئی تھی، کس خیال میں تھی، کون جانے، ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے عتیق اس کو آواز نہ دیتا تو شاید وہ اسی طرح کھڑی رہتی، عتیق کی آواز پر وہ چونکی، اس کا بھیگا رنگ، سلک کی ساڑی پر کھلنے والا نیلا بلاؤز اور سینے پر لہرانے والی دو ناگنیں، سنگِ مرمر کی سی شفاف گردن پر سیاہ خال! ———

لیکن انسان کے ارادے بہت کم پورے ہوتے ہیں۔ اسی کے بازو والے کمرے میں چند طالب علم اس قدر بلند آوازیں گفتگو کر رہے تھے کہ غیر ارادی طور پر اس کے خیالات متاثر ہو رہے تھے۔ ایک لڑکے کی آواز سب میں نمایاں تھی ——— "کیا ہوگا اس سال؟ میں بہت پریشان ہوں!"

"کیوں؟" دوسرے نے پوچھا۔

"بھئی فیس! امتحان قریب ہے، ابھی تک فیس داخل نہیں کی۔ میرے والدین دیہات میں بھوکے مر رہے ہیں۔

"یہ تو ہوتا ہی ہے، ابھی تمہیں کالج لائف کے مزے نہیں معلوم، اور پھر گھبرانے سے فائدہ ع مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔"

"کالج لائف! کالج لائف کا لطف پیٹ بھروں کے لئے ہے۔ مجھے کیا؟ ٹینس، پکچرس، ریسٹوران اور ——— لڑکیاں! یہ سب امیروں یا غافلوں کے

چونچلے ہیں، ہم تو سمندر میں بھی پیاسے رہ جائیں گے! ——— کاہے کی کالج لائف؟"

رس بھری کہانی کے حسین خیالات اس کے دماغ سے جھانک رہے تھے اور ایسے وقت بازو والے کمرے میں خشک مسائل، بھوک، بیچارگی، افلاس اور کال ——— کیا یہی ہے زندگی؟ جنگلی ہیں لونڈے! یہ کیا جانیں کالج لائف؟ کالج کی سنہری زندگی میں دُنیا کے مزے نہ لوٹیں تو کیا کل بال پکنے پر!

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر پھر لکھنا شروع کیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ آج یہ کہانی مکمل نہ ہو گی! سامنے نل پر ایک عورت دوسری سے کہہ رہی تھی ——— گھر میں ساس بیمار ہے، بیس دن سے ایک کھیل بھی منہ میں نہیں گئی، بارش آ رہی ہے اور گھر پہ کچھ نہیں۔ پھوس بھی ہوا سے اڑ گئی۔ بڈھیا کی ہڈیاں اور گھر کے بانس ایک سے ہو گئے، وہ دن بھر محنت کرتے ہیں۔ مگر دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی! ———

وہ جھنجھلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سامنے والے گھر میں کون ہے۔ لیکن اس لڑکی نما عورت کو اس نے اکثر دیکھا تھا۔ شاید وہ کسی کی بیوی تھی۔ مزاج کے دونوں اچھے تھے لیکن قحط اور گھر کے کام کاج اور وقتی ضروریات نے جیسے انھیں نچوڑ دیا تھا!

کسی نے ایک عورت کے متعلق اس سے کہا تھا، اس کا بچپن ——— بچپن ہی کیا بلکہ شادی تک کی عمر تکلیف میں کٹی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں طعنے دیا کرتی تھی۔ آخر ایک ایسے رنڈوے سے اس کا بیاہ ہو گیا جس کے دو بچے تھے۔ اور اب اگر وہ سکھی نہیں تھی تو دکھی بھی نہیں تھی!

لیکن عتیق کے لئے جیسے کوئی بات اہم نہ تھی۔ اسے سب کچھ بے رس، بے کیف اور بے رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مختلف رنگین چراغ تھے اور ان چراغوں کی گوناگوں روشنی میں پریاں رقص کر رہی تھیں۔ اس کے تصورات کے پردوں پر بی۔ اے کا پہلا درجہ تھا، پروفیسری تھی اور چوٹی کو مروڑتے ہوئے

توبہ، توبہ، چھی، کر کے پچاس مرتبہ گردن کو ہلانے والی دوشیزہ تھی! ہر روشنی اور ہر رنگ میں شہناز مختلف زاویوں سے دکھائی دے رہی تھی ——

ولز کا دھواں سارے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ کسی نامعلوم مقام سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے ساری فضا سارے ماحول میں رومانی ترنگیں اٹھ رہی ہوں!

اسے تو ایک لاجواب کہانی لکھنی تھی۔ بہت ہی دلچسپ۔ شہناز کے ہر خم کی طرح دلآویز! اس کی سیاہ، گہری اور چمکدار آنکھوں کی طرح جاذب شکنتلا اور روشنیت، کلوپیٹرا اور انطونی کے معاشقے سے زیادہ جذباتی شہناز کی مسکراہٹ سے زیادہ رنگین، کالج کی زندگی کا رومانی خاکہ! لیکن ماحول سازگار نہ تھا۔ بازو والے کمرے میں دولت و غربت پر بحث ہو رہی تھی! سامنے نل پر عورتیں گرہستی کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا توبہ توبہ، یہ بھی کوئی ماحول ہے؟ رومانی داستان، جذباتی کہانی۔ اور دیدہ و دل کی پرکاری ایسے ہی مقام پر بیان کی جاتی ہے؟ دلدل میں پھنسے رہ کر نیلگوں فضا میں پرواز ——؟

نہیں، نہیں، افسانہ لکھنا ہی چاہیئے، اس نے قلم آگے بڑھایا۔ مگر ایک بار جوڑ کھل جانے کے بعد پہلی سی بات تھوڑی پیدا ہو سکتی ہے؟ شور و غل، بے رنگ فضا، ناہموار زمین اور اداس ماحول میں سمند فکر ایک قدم بھی اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر سستانے کے لئے گیلری میں چلا آیا جیب سے ایک سگریٹ نکال کر جلایا۔ اور فضا میں پیچ و خم کھانے والے دھوئیں کو گھورنے لگا۔ جیسے دھوئیں کے ہر حلقے میں شہناز کھڑی مسکرا رہی تھی!

وہ اسی طرح خلا میں گھورتا رہتا۔ مگر سامنے والے کمرے میں سے

مسعود نے کہا ——— "اماں عتیق! اسٹیٹین دیکھا ہے آج کا؟"

"نہیں تو! کیوں کوئی افسانوی مقابلے کا اعلان ہے؟"

مسعود نے زہر خند کے ساتھ کہا ——— ارے کاہے کا افسانہ! تم ابھی سپنوں کی دنیا میں ہو! سارے بنگال میں بھوک کے مارے ایک انسان دوسرے انسان کی ہڈیاں چبا رہا ہے، اناج کا ایک دانہ نہیں، فوجیوں کی قے اور تھوک میں غذا کے ذرے دیکھ کر کتّے اور انسان دوڑ پڑتے ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ایک شخص نے صرف دو وقت کے کھانے کی خاطر اپنی نوجوان لڑکی بیچ دی۔ توبہ، توبہ، کتنی خوفناک ہے یہ بات!

"ہوں" کر کے عتیق نے گردن پھیر لی، جیسے یہ کوئی اہم بات نہ تھی بنگال میں قحط، پنجاب میں طغیانی سے کیا غرض؟ اسے تو نغمہ و مئے حسن و جوانی، شعر و شباب کی رنگینیوں کی ضرورت تھی۔ اور لوگ الٹے افسردہ کن باتیں سنا رہے تھے کہیں کپڑا نہیں، کہیں اناج نہیں۔ کسی نے لڑکی بیچ دی۔ کوئی خودکشی کر رہا ہے! جیسے انسان کے حصے میں یہی ساری باتیں آئی تھیں!! ———

وہ اندر چلا آیا۔ دنیا کے اس ہیبت ناک پہلو سے بیزار ہو گیا۔ وہ کالج کی چار دیواری کی رنگینیوں اور غالبؔ، ذوقؔ و مومنؔ کی جنت۔ شیکسپیئر اور ورڈسورتھ کی دنیا چاہتا تھا، صرف ایک بات کا اسے قلق تھا، ایک فکر تھی، ایک کمی ——— شہناز کی محبّت!!

شہناز کی محبّت نے اسے پھر تڑپا دیا، اس کے اندر شعریت جاگنے لگی وہ شہناز کی زلفوں کو اپنے بازو پر پریشان دیکھنا چاہتا تھا۔ تصورات کی دنیا میں وہ سکھ کے ساحل پر ہی دوڑنے لگا، وہ بے حد رنگین کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ ایسی کہانی جسے پڑھ کر شہناز رقص کرنے لگے۔ اور بھٹکی ہوئی پتنگ پھر

اپنی جگہ پہنچ جائے۔

اُس نے شہناز کے سارے خطوط جمع کئے۔ اور ہر خط کے دو چار جملوں پر سُرخ پنسل کے نشان لگا دیئے تھے۔ بالکل پہلے ہی خط میں لکھا تھا۔

——— تمہاری آنکھوں میں جادو ہے۔ میرا جی ہر وقت تمہارے سامنے بیٹھے رہنے کو چاہتا ہے، کہاں سے پیدا کیا تم نے یہ جادو؟ ——— میں تمہارے مزاج کا صحیح رنگ نہ پا سکی! بالکل سمندر کی طرح ہو تم، لیکن تمہاری شہناز بزدل ہے! سمندر میں غوطہ لگا کر موتی نکالنے کی ہمّت اس میں نہیں ہے پھر موتی خود کیوں اوپر نہیں چلا آتا!

——— پتھر اور پھول میں ایسی کیا رفاقت ہے؟ کون جانے! پتھر کی مورتی پر پھول چڑھائے جاتے ہیں، مرد سخت دل اور بے درد ہوتے ہیں، پھر بھی عورتیں ان سے محبّت کرتی ہیں، کوئی سبب؟ ———

یہ سارے جملے پڑھ کر اس نے محسوس کیا کہ شہناز کے پاس "شاعر کا دل" ہے۔ اس قدر محبّت کی دیوانی لڑکی۔ اپنی چار سالہ محبّت و الفت کی کہانی اتنی جلد فراموش نہیں کر سکتی!

چار سال ——— یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ جوانی کے دکھ سکھ کے تصورات سے اسے عجیب مزہ آیا۔ سفید پوشوں کی طرح وہ بھی تصوّرات کے ہنڈولے میں جھولتا رہا۔ یہ پہلا ملّاح تھا جس نے اپنے خاندان میں تعلیم کی ناؤ کو میٹرک کے ساحل تک پہنچایا تھا۔ سرپرست چاہتے تھے کہ وہ اپنی جوانی کی نازک کونپل کو کتابوں کی نذر نہ کر دے۔ مگر وہ پڑھنا چاہتا تھا۔ ایک بار شیرنی کے دودھ کی لذت چکھنے کے بعد۔ وہ کیا ماننے والا؟

بی۔ اے کے لئے وہ یونیورسٹی پہنچا! اس نے یونیورسٹی کی زندگی کی صرف

کہانیاں سنی تھیں، تماشے دور ہی سے دیکھے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد البتہ مزدور شاہی، سماج شاہی، سرمایہ داری، ادب اور اقتصادیات کے خشک و بے رس مسائل کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ گلاب کی طرح نازک، رنگین اور معطّر گتھیاں بھی سلجھانے لگا تھا ——— بتول اچھی ہے یا ناہید دلفریب ہے؟ یا ہنس مکھ الھڑ شہناز موہنی ہے؟

اس نے کالج کے میگزین میں ایک مضمون "نئی عورت" لکھا۔ یہ مضمون طبقۂ نسواں میں اس قدر مقبول ہوا کہ شہناز خود اس سے مل کر بولی ——— "کتنا اچھا لکھتے ہو عتیق! ایک بار تمہارے مضامین دیکھنے کے لئے تمہارے گھر آؤں گی۔"

عتیق کو محسوس ہوا جیسے یہ ایک لمحے کا خواب تھا۔ اگر اس کے خاندان کی اگلی چالیس پشتیں اس پر گلاب برساتیں تو بھی اتنی مسرت نہ ہوتی! ——— ایک مشہور متمول آفیسر کی لڑکی نے بات کی، تہنیت پیش کی، شاباش، جیت تیری ہے! ———

عتیق ہر وقت شہناز کی نگاہِ غلط انداز کا متمنی رہنے لگا۔ ایک نامعلوم نشے سے دونوں سرشار رہنے لگے۔ عتیق شہناز کی خاطر افسانے لکھنے لگا، اس کی اکثر کہانیوں میں اسی کا سراپا، اسی کے کردار ہوتے تھے، وہ لکھتا تھا اور خوشی سے ناچنے لگتا تھا۔ وہ اب چھٹیوں میں بھی گھر جانا نہیں چاہتا تھا، گاؤں کی معصوم فضا، اداس اور بکھرے ہوئے ماحول میں اس کے شہری ذوق کی تسکین کہاں؟ وہ شہر میں محبت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اور ادھر روپے بھیجتے بھیجتے باپ کا دم نکلا جا رہا تھا۔

لیکن ٹھیس لگی اور کانچ کے برتن ٹوٹ گئے، بی۔ اے میں چند نشانات سے

ناکام رہا۔ شاید شہناز کی محبت کا سبب ہوا ـــــ مگر شہناز کھنچ گئی، وہ اب کم ملنے لگی تھی۔ لیکن یہ ناکامی اس کی سدِّ راہ نہ ہوئی۔ اس کے عزم و جرأت نے پھر ایک بار جھرجھری لی، وہ کسی طرح سلسلۂ آرزو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر کہانیاں لکھنی شروع کیں اور ایک موہوم امید پر آج بھی ایک ایسی رومانی داستان لکھنا چاہتا تھا کہ شہناز پھر ایک بار جھومتی چلی آئے۔

خیالات کی ترنگوں میں ڈوبنے کے لئے اس نے سگریٹ کے دو لمبے لمبے کش لئے، لیکن حسین الفاظ، نازک تشبیہیں اور عشق و محبت کے بیان پر جیسے آج وہ قادر نہیں تھا۔ امنگ اور اکساہٹ نام کو نہ تھی۔ اس نے فوراً کمرے کا دروازہ بند کیا اور ہوٹل چلدیا۔ ہوا کچھ رک سی گئی تھی۔ سارے ماحول میں ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا۔ ایک دکان کے سامنے بہت سے لوگ قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں خالی ڈبہ تھا اور کسی کے ہاتھ میں شیشے! عتیق کو ذرا تشویش ہوئی۔ آخر اتنے لوگ کیوں کھڑے ہیں؟ ـــــ ہاں! اور پھر وہ سب کچھ بھانپ گیا ـــــ مٹی کا تیل! جنگ کی وجہ سے مٹی کا تیل عطر سے زیادہ کمیاب ہو گیا تھا۔ اپنے گھروں کے اندھیرے کو دور کرنے کے واسطے ہزاروں کام چھوڑ کر دھوپ میں کھڑے رہنے والوں پر وہ پسیجا! مزدوروں کی زرد، مرجھائی ہوئی عورتیں بھی ان میں تھیں، ایک عورت دوسری سے کہہ رہی تھی۔

"لڑائی کب ختم ہو گی، خدا جانے! گھر میں تیل کی بوند نہیں۔ رات بچھو نے بچے کو ڈنک لگائی، کس مونڈی کاٹے نے یہ لڑائی شروع کی۔"

جرمنی ریڈیو کے معلن سے بھی زیادہ پھرتی اور جوش کے ساتھ گالیاں دینے والی عورت پر اسے اچنبھا ہوا، دوسرا ایک شخص بیڑی کا ٹوٹا منہ میں دبائے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ـــــ "آخر کس کس کی فکر کریں؟ راتب بندی کی فکر

گاؤں کی ہوا خراب۔ مٹی کا تیل نہیں! اَیں! میں تو بالکل پریشان ہوگیا۔ چور دروازوں سے تیل خریدنے کے لئے تو ہم کوئی پیسے والے نہیں ہیں؟"

عتیق کو حیرت ہوئی، لوگ اس درجہ پریشان ہیں؟ اسے فکر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کمرے میں بجلی تھی، باپ کافی روپیہ بھیجتا تھا، بیٹا محبت کا کھیل کھیل رہا تھا، اچھی غذا، اچھے کپڑے، سینما اور ہوٹل! لوتھیاریو (LOTHARIO) ٹائپ کے افسانوں کے لئے ہوٹل ہی تو اچھی جگہ ہے۔ اور چائے تو ہر فن کار کے تخیّل و تصور کی جان ہے، پیالی کی بھاپ کے ساتھ خیالات اڑنے لگتے ہیں۔

ہوٹل سے لوٹا تو کچھ دیر دُنیا کی ویرانی و بربادی پر غور کرتا رہا۔ مگر سامنے میز پہ شہناز کی تصویر پر نظر پڑتے ہی شہناز کی محبت کے تصوّر نے سارے اندیشوں کو نابود کر دیا۔ خیالی فلسفہ میں جینے والا حقائق کی تلخیوں کو کب تک برداشت کرتا۔ فوراً ہی کمرہ بند کر دیا۔ اور پھر ایک بار عشق و حسن کی مملکت میں قدم رکھ دیا۔ تمام کمال یکسوئی کے ساتھ لکھنے لگا ——— گہری، شفاف نیلگوں آنکھیں جیسے امرت کے چھلکتے ہوئے کٹورے! اُمڈتے ہوئے سینے کے ابھرتے ہوئے نقطوں میں جیسے دو جہاں پوشیدہ ہیں، تیری باہوں کا گداز، کہنیوں کا خم، کمر کا بل، ابروؤں کا تیکھا پن، عورت ہے یا مجسم خطوط خمیدہ ——— ٹیڑھا خط مجھے سیدھے خط سے زیادہ ——— کھٹ سے پوسٹ مین نے کمرے میں خط پھینکدیا ——— توبہ! وہ جھنجلایا، اٹھا اور سرنامہ کی تحریر دیکھ کر یکایک سینے سے لگالیا اور بڑبڑایا ——— ڈارلنگ! شہناز!! پیاری شہناز!!! ———

لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ تخیل کے ڈور پہ بسیط فضا میں فراٹے بھرنے والی پتنگ حالات کی آندھی میں تھوڑی ٹھہر سکتی ہے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل سے امید و بیم کے عالم میں خط چاک کیا لکھا تھا

——— تمہاری حالت چاند کو دیکھ کر اسے پکڑنے کے واسطے ضد کرنے والے بچے کی سی ہے، دیوانہ بھی تو سفید اور کالے ربر میں فرق محسوس کرتا ہے! محبت ربر کی سی ہوتی ہے، زیادہ کھینچنے سے ربر ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ پرسوں میری شادی ایک پروفیسر سے ہو رہی ہے، تم مجھے بھول جاؤ ——— میں بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں بس ———

وہ مسکرا دیا، مگر یہ تبسم بجھتی ہوئی راکھ میں چمکنے والی چنگاری تھی! اسے محسوس ہوا جیسے اس نے زندگی کے کتنے ہی حسین اور سرور انگیز لمحات کھو دیئے! اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی اتاہ گہری غار میں ڈھکیل دیا گیا ہو، وہ آرام کرسی میں درا ہو گیا اور قلم پھینک دیا ———

اس کے سپنوں کا محل گر گیا، شہناز اس سے الگ ہو گئی، حالات پر قابو پانے والا خود زیر ہو گیا تھا، ساری دنیا ایک کیچڑ کا گولہ دکھائی دے رہی تھی۔ پہلے بھی اس کے دل میں درد تھا، سوز تھا، لیکن اظہار کے مواقع نہیں تھے مگر اب شہناز کے جاتے ہی اس کا دل اس آوارہ جانور کی طرح ہو گیا۔ جس کی ناک میں ہوا گھس گئی ہو ———

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور خط کو چاک کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ——— محبت ربر ہے؟ ہوں! جس محبت کی بنیاد وقت، مقام، دولت عزت اور زمانے کے تابع ہو وہ محبت ہی کب ہے؟ ہوس کے معنی محبت نہیں! ——— محبت تجارت، بیوپار اور نفع و نقصان اور بیش و کم سے بے نیاز ہے بہشت! محبت زمانہ ساز نہیں ہے ——— عورت نام ہے تلون کا! ——— چھوٹی ہو یا بڑی ہر عورت زہر کی گانٹھ ہے! یہ کہنے کے لئے شکسپیر کوئی بیوف تو نہ تھا!۔

اور وہ اپنے مجروح دل و دماغ کو تسلی دینے کے لئے ٹوٹے ہوئے

جہاز کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا، مگر ناکامی اور مایوسی کا خیال اس کے دل پر ایسی ضربیں لگا رہا تھا جیسے چھری گوشت کے ٹکڑے پر!

اُس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایک کتاب اٹھالی۔ عبارت پر نظر پڑی، مصنف نے حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا تھا ——— "ملک کا موجودہ گرداب، خیالات کے بھنور، آزادی کی کشمکش، زندگی کے زلزلوں میں ہزاروں کی بھینٹ، اربابِ اقتدار کا کمینہ پن، سرمایہ داروں کی نفع اندوزی، غریبوں کی ہلاکت، فاقے، قحط، راتب بندی کے مناظر ابھی تک ہماری کہانیوں میں نظر نہیں آتے۔ خوش حال طبقے کے چونچلوں، شوخ و شنگ دوشیزاؤں کے ناز و غمزے، کھوکھلے سماجی اصولوں پر ہی ہماری ادبی تصاویر کے خاکے تیار ہو رہے ہیں، بوس و کنار، وصل و ہجر اور زلف و نظر کے بغیر ایک صفحہ بھی لکھا نہیں جاتا، چٹخارے کی کہانیوں اور گھٹیا ناولوں کی مستی میں اچھے اچھے اہلِ قلم ——— اور ان کا پرچار کرنیوالے لذت جو، اور عیش کوش، ناعاقبت اندیش نوجوان ———!"

وہ آگے پڑھ ہی نہ سکا۔ کتنی حقیقت نگاری سے کام لیا تھا مصنف نے! سچ ہے صداقت چھپ سکتی ہے نابود نہیں ہو سکتی۔ اس نے کتاب رکھ دی سوچنے لگا، واقعی.....

اور پھر ایک سگریٹ جلایا، پان منہ میں رکھ لیا اور اپنی لکھی ہوئی کہانی پر غور کرنے لگا ——— مخملی باہیں، جھیل کی طرح شفاف آنکھیں، ہنس کی جیسی سپید گردن، نقطوں کا ابھار، خطوط کا خم، لیکن ——— لیکن یہ سوداگردی! محبت اور بیوپار، فاقے، قحط، غربت، ہلاکت ——— سوچتے سوچتے اس کی نگاہ سامنے آئینے پر پڑی۔ کتنی جلد پان کا رنگ چھوٹ گیا تھا! اسے محسوس ہوا کہ زندگی کے سکھ بھی تو ایسے ہی ہیں! بہت معمولی اجزا، چھالیہ، چونا، کتھا اور الائچی کے ساتھ

پان رنگ پکڑ گیا! مسرت وسکون خوابوں میں نہیں ہے۔ ناکامیوں کی لذت زندگی کا پیام ہے! زندگی خوابوں سے زیادہ دلفریب ہے، خواب سہانے..... مخمل کی طرح گداز، نرم، پرسکون، تکیئے، مسہری اور صوفے، سب کچھ مخمل۔ لیکن اس کے اندر کے کانٹے کہیں نظر انداز کئے جا سکتے ہیں! ——

یکایک سامنے سڑک پر ترانے کا شور سنائی دیا۔ اور اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سیکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا، عورتیں تھیں، بچے اور بوڑھے بھی تھے، اسے بڑی حیرت ہوئی۔ لوگ باگ چیخ رہے تھے۔

"بھوکے بنگال کی مدد کرو —— بنگال کے باشندے سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ بنگال کی موت سارے ہندوستان کی موت ہے۔"

عتیق جھنجلا گیا کہ اس کے مخملیں خوابوں میں یہ کانٹے کیسے چبھ گئے۔

——†——

انند نرائن ملّا

موت

جنگ کی موت تو ہے طالعِ بیدار کی موت
ننگ قومی کے لئے قوم کے جرّار کی موت
سرفروشی کی اجل غیرت و ایثار کی موت
کسی مقصد کے لئے مرد وفادار کی موت
نوعِ انساں کی روایات ہیں زندہ جس سے
روئے تاریخ پہ ہے سُرخیٔ غازہ جس سے
ہے مگر قہر وہ بے موت کی ڈھائی ہوئی موت
ناتوانوں پہ توانا کی بلائی ہوئی موت
شہ نشینوں سے زمینوں پہ گرائی ہوئی موت
چور بازار کے سکّوں کی چلائی ہوئی موت
قتل کر دے کسی بے کس کو ہلاکو جیسے
لوٹ لے خانۂ بیوہ کوئی ڈاکو جیسے

شاہد صدیقی

گیتوں کی بستی میں ——— نوحے

اک عمر سے ہے دُنیائے وطن ناکام نظاموں کی دُنیا
مفرور دماغوں کی محفل مجبور غُلاموں کی دُنیا
اخلاق کی بے پردہ لاشوں پر چشمِ حمیّت روتی ہے
ناداری کے بازاروں میں عزت کی تجارت ہوتی ہے
اُس ملک میں انسانیت کے فرمان سُنائے جاتے ہیں
مرتے ہوئے انسانوں کو جہاں چوپائے کھائے جاتے ہیں
جانوں کا یہاں کچھ ذکر نہیں عزت کی نشانی ارزاں ہے
ماؤں کا تقدّس ارزاں ہے بہنوں کی جوانی ارزاں ہے
جینے کا سبب بننے والے مرنے کی تمنّا کرتے ہیں
اس دُنیا میں بھوکے ہیں وہی جو غلّہ پیدا کرتے ہیں
آنسو آنکھوں میں جھلکتے ہیں فریادیں لب تک آتی ہیں
جب پیٹ کا دوزخ بھرنے کو اولادیں بیچی جاتی ہیں
بنگال کا سورج یوں چمکا سب لطف شبانہ لوٹ لیا
فاقوں کی مسلسل آفت نے نغموں کا خزانہ لوٹ لیا

ہر گام پہ کچھ افتادیں ہیں ہر موڑ پہ کچھ بیدادیں ہیں
ان گیتوں کی آبادی میں فریادیں ہی فریادیں ہیں

ALLAMA IQBAL LIBRARY
3519

سلیمان اریب

بنگال

اب بھی شاہی کی حکومت ہے دلوں پر جاری
اب بھی سرمایہ کی نکبت ہے جہاں پر طاری
اب بھی ناداری کا انجام وہی غم خواری
اب بھی آدم سے ہے آدم کو وہی بیزاری
اب بھی کہنا کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے
میں نہیں مانتا، ہوتا ہے تو کیا سوتا ہے

اب بھی دہقان ہی بھوکا ہے بڑی حیرت ہے
اب بھی مزدور ہی ننگا ہے بڑی حیرت ہے
دہنِ انصاف پہ تالا ہے بڑی حیرت ہے
دن ہے اور پھر بھی اندھیرا ہے بڑی حیرت ہے
اب بھی کہنا کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے
میں نہیں مانتا، ہوتا ہے تو کیا سوتا ہے

دردِ افلاس کا اب بھی نہیں درماں کوئی
زخمِ فریاد کا اب بھی نہیں پُرساں کوئی
نالۂ نیم شبی پر نہیں، نالاں کوئی

نعشِ بے گور و کفن پر نہیں گریاں کوئی
اب بھی کہنا کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے
میں نہیں مانتا، ہوتا ہے تو کیا سوتا ہے

پیارے چنگیز و ہلاکو کی جفاؤں کی قسم
کج کلاہوں کی جہاں سوز اداؤں کی قسم
بے سبب دی ہوئی سنگین اداؤں کی قسم
ظالم و جابر و قہّار خُداؤں کی قسم
اب بھی کہنا کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے
میں نہیں مانتا، ہوتا ہے تو کیا سوتا ہے

ارضِ بنگال پہ کیا دیکھ رہے ہو بولو؟
دیکھو دیکھو یہ سسکنے کا سماں تو دیکھو
خیر! جانے دو یہ رونے کی صدائیں تو سنو
ہائیں! کیا بات ہے کیوں پھیر لیا نظروں کو
اب بھی کہنا کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے
میں نہیں مانتا، ہوتا ہے تو کیا سوتا ہے

—†—

نفیس ترین کتابیں

چالیس کروڑ بھکاری۔ ابراہیم جلیس ۱۲-۲

تکونا دیس۔ 〃 〃 ۱۲-۲

طوفان ..... رئیس احمد جعفری ۶-۳

سیر افغانستان۔ .... سید سلیمان ندوی ۸-۲

اسلام کے سیاسی تصورات .... دستگیر رشید ۱۲-۲

داستان کربلا۔ عبدالرحمن سعید ۱۴-۲

حکمت اقبال۔ غلام دستگیر ۰-۴

فکر اقبال۔ 〃 〃 ۰-۴

تصورات اقبال۔ شاغل فخری ۶-۳

فلسفۂ عجم۔ علامہ اقبال ۲-۳

کوہ نور کی سرگذشت۔ ۴-۱

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم ۱۲-۲

تاجدار دو عالم۔ مترجمہ ظہوری ۱۲-۰

جہان آرزو۔ آرزو لکھنوی ۱۲-۲

غبار۔ قیسی رامپوری ۴-۲

ضربیں۔ 〃 ۰-۳

سرنوشت۔ مجنوں گورکھپوری ۰-۲

ذکر جمیل۔ ماہر القادری ۱۲-۱

ہچکیاں۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۴-۳

ناتمیت شاید رزاقی ۱۲-۲۰

آج کل کے رومان۔ افانے ۱۲-۲

قائدین کے خطوط جناح کے نام۔ ۰-۲

معاشیات پاکستان۔ علامہ القدوس ہاشمی ۸-۱

مقالات جمال الدین افغانی۔ رفعت ۸-۳

نئے ادبی رجحانات۔ سید اعجاز حسین ۸-۳

مقام جمال الدین افغانی۔ مبارز الدین رفعت ۳

ALLAMA
IQBAL LIBRA
UNIVERSITY OF KA
HELD TO RULES THIS B
PROVIDED GLEA

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN